چرخ چنیوٹی

حسنِ ادب

شاعرِ رومان چرخ چنیوٹی

ناشر

بزمِ جمالِ اردو، ۴۳۴۱۱ جی۔ٹی روڈ شکتی نگر۔ دہلی ۷

قیمت مجلد پانچ روپے غیر مجلد تین روپے

(جنوری سنہ ۱۹۷۰ء)

گورو نانک دیو کی پانچویں جنم شتابدی

کے سلسلے میں

شردھا کے پھول

خورشید ضیا بار ہے نانک میرا
اک پیکر انوار ہے نانک میرا

شبدوں میں کہیں شرک کا پرچار نہیں
وحدت کا علمدار ہے نانک میرا

ست دھرم کا اپدیش دیا دنیا کو
اونکار کا اوتار ہے نانک میرا

جو شرن میں آیا اسے بخشی معراج
رحمت بھرا بھنڈار ہے نانک میرا

اخلاص و محبت کا رواداری کا
روشن تریں مینار ہے نانک میرا

جو آتا ہے جاتا ہے مرادیں لے کر
داتار کا دربار ہے نانک میرا

اِنتساب

والد بزرگوار ملک دیال مل کپور کے نام

(جن کی وفات مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۴۳ء کو بمقام چنیوٹ ہوئی)

دھندلی دھندلی سی ہے تصویر مری آنکھوں میں
عہدِ رفتہ کی یہی اک ہے نشانی باقی

چرخ

حضرتِ چرخ پہ ہیں ناز ہزاراں ہم کو
زیب دیتا ہے انہیں کہتے وطن کا سہرا
(علّامہ خضر تمیمی)

سُنہری پیشکش

شاعرِ زماں جناب چرخ چنیوٹی کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں ان کی تازہ تصنیف "حسنِ ادب" مشتاقانِ ادب کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

جناب چرخ سے متعلق بہت کچھ "حسنِ نظر" میں سپردِ قلم کیا جا چکا ہے ان کی ادبی خدمات مسلّمہ ہیں۔ آج کے دور کے نقادانِ ادب کی آرا کتاب ہٰذا کے آخر میں قارئین کے ملاحظہ کے لئے درج کی جا رہی ہیں۔

کلام خود ذریعۂ تعارف ہوتا ہے۔
مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطّار بگوید

یہ امر باعثِ مسرّت ہے کہ ہم دو سال کے قلیل عرصے میں "حسنِ نظر" از چرخ چنیوٹی "تجلیات" از پروفیسر بخشی اختر امرتسری شایع کرنے کے بعد اب تیسری سُنہری پیشکش "حُسنِ ادب" پیش کر رہے ہیں۔

یقین واثق ہے۔ کہ سابقہ پیشکشوں کی طرح "حسنِ ادب" بھی سخن شناسوں سے شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔

ناظمِ اعلیٰ بزمِ جمالِ اُردو

چرخ چنیوٹی

۵
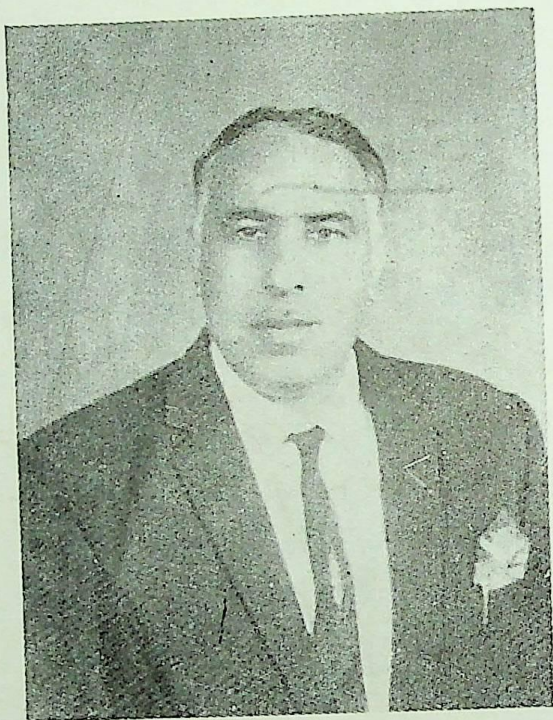
چرخ چنیوٹی

(ترجمانِ ادب جناب چندر موہن لانبہ ایڈیٹر سینک سماچار نئی دہلی)

قریباً بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ مجھے لاجپت نگر نئی دہلی میں رام نومی کے سلسلہ میں منعقدہ ایک مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جس وقت میں وہاں پہنچا، ایک سرو قد، خوش شکل شاعر کو اس کے ہر شعر پر داد مل رہی تھی۔ کرشن موہن میرے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ان سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ داد پانے والے شاعر چرخ چنیوٹی ہیں۔ مشاعرہ کے اختتام پر ان سے ملا اور ان کے تئیں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ چرخ چنیوٹی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کی شخصیت میرے ذہن پر امٹ نشان چھوڑ گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اکثر ملنے لگے۔ اس دوران میں مجھے چرخ کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک مخلص انسان دوست، بااخلاق اور بلند کیریکٹر انسان ہیں۔ اس حد تک۔ کہ اگر کوئی غیر آنچل ان کے بدن سے چھو جائے تو اس کی برقی لذت سے محظوظ ہونے کی بجائے وہ پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ شراب اور سگریٹ کو بدعت سے کم نہیں سمجھتے۔

چرخ شاعرِ رومان ہیں۔ ندرت اور تیکھا پن ان کے کلام کی خصوصیت ہے وہ شاعری برائے شاعری کے قائل نہیں۔ ان کا ہر شعر ایک مقصد، ایک پیغام

لئے ہوتا ہے۔ اندازِ بیان انتہائی سادہ مگر دلنشیں، اس درجہ کہ فوراً ہی ان کے شعر دل کی گہرائیوں تک سرائت کر جاتے ہیں بھری بزم میں بہت بڑی بات اس خوبصورت انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

چرخ کی سب سے بڑی خوبی، ان کی باغ و بہار شخصیت ہے، بات بات پر شعر کہنا ان کی فطرت ہے، خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا اُن کی زندگی کا ماحصل ہے۔ اُن کا کہنا ہے۔ کہ قنوطیت انسانی زندگی کو کم کر دیتی ہے۔ اور اس کی ساری صلاحیتیں سلب کر لیتی ہے۔ جب موت کا ایک دن معین ہی ہے اور وہی کچھ ہوتا ہے۔ جو مقدر میں رقم کر دیا گیا ہے۔ تو کیوں نہ ہنسی خوشی زندگی کے دن بسر کیے جائیں۔ ان کا کلام اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ کہ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اُن کا کلام حقیقت افروز ہے۔ لیکن انہوں نے اس پر شباب نوازی کا لبادہ اوڑھا رکھا ہے۔ "تاکہ زندگی کی تلخیاں محض تلخیاں ہی نہ رہ جائیں، غم محض غم ہی نہ رہ جائیں۔ ان میں مسرتوں کے کوندے بھی لپکتے رہیں، اور خوشیاں بھی جابجا بکھرتی دکھائی دیتی رہیں۔

———— ٭ ————
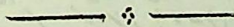
مشاہدات چرخ

(از نجم الشعراء شاعر خوش کلام پروفیسر بخشی اختر امرتسری)

"حسنِ ادب" میرے عزیز دوست شاعر رُومان چرخ چنیوٹی کی تازہ تصنیف ہے۔ جو قطعوں۔ رُباعیوں۔ غزلوں اور نظموں کا ایک حسین و دلکش مجموعہ ہے۔ چند ایک فارسی غزلیں بھی زینت اوراق ہیں۔ جن سے چرخ صاحب کی فارسی گوئی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہاں مجھے "حسنِ ادب" یا چرخ چنیوٹی سے متعلق کچھ سپردِ قلم نہیں کرنا۔ کیونکہ چرخ صاحب اور اُن کے کلام و انداز بیان سے متعلق ان کی سابقہ تصنیف "حسنِ نظر" میں سیر حاصل روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

چرخ صاحب کے کلام میں جس خوبی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے۔ وہ ان کی واقعات و مشاہدات کی بندش ہے۔ کیا قطعے۔ کیا رُباعیاں اور کیا غزلیں، چرخ صاحب نے سب میں اپنے مشاہدات کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔

قطعہ ملاحظہ ہو جس کا پس منظر یہ ہے کہ آپ نے خوشبو میں بسی ہوئی کسی سرو قد حسینہ کو ریشمیں ساڑھی کے کئی پیچوں میں ملبوس دیکھا۔ اس منظر سے متاثر ہو کر برجستہ یہ قطعہ کہہ دیا۔

اس مہکتے ہوئے بدن پر یوں ‏ پیچ کھا کر لپٹ رہا ہے لباس
کنڈلیاں جس طرح لگائے ناگ ‏ پا کے چندن کے پیڑ کی بُو باس

اور قطعہ ملاحظہ فرمائیں جس میں کسی حسینہ کی کشیدہ کاری کرتے ہوئے اس کی

انگلیوں کا کشیدہ پر تیز چلنے کا نظارہ پیش کیا گیا ہے۔ کشیدہ کاری کے وقت انگشت اشارہ کی خم کھانے سے (۸) یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہرنی جب سبزہ زار میں اچھل کود کرتی ہے۔ تو اس کی شکل بھی بعینہ ۸ کی طرح نظر آتی ہے تشبیہ کی موزونیت ملاحظہ ہو۔

نرم و نازک سی انگلیاں اُن کی ۔۔۔ یوں کشیدے پہ تیز چلتی ہیں
سبزہ زاروں میں جسطرح اے چرخ ۔۔۔ ہرنیاں کودتی اچھلتی ہیں

دفتر انکم ٹیکس کی سیڑھیاں اُترتے وقت جب زینہ میں حسن سے آپ کا تصادم ہوا۔ اُس وقت آپ کی جو حالت ہوئی قارئین ملاحظہ فرمائیں۔

تنہا زینے میں حسن کا ملنا ۔۔۔ کتنا رومان خیز ہوتا ہے
نظریں ٹکتی ہیں پاؤں رکتے ہیں ۔۔۔ ہر نفس نیز تیز ہوتا ہے

اس سے بہتر مشاہدہ کی عکاسی اور ترجمانی کیسے ہو سکتی ہے

ایک روز چرخ صاحب یونیورسٹی ایریا میں سے گذر رہے تھے۔ راقم بھی ساتھ تھا۔ روپہلی مسکراہٹیں لیے جوانیوں کا ہجوم دکھائی دیا جس سے ہمارے لیے صحیح سلامت بچ نکلنا قیامت سے بچ نکلنے سے کم نہ تھا۔ چرخ صاحب نے فی الفور قطعہ موزوں کیا۔

جوانیوں کے تلاطم سے بچ کے آیا ہوں ۔۔۔ ہر ایک موج تبسم سے بچ کے آیا ہوں
قدم قدم پہ قیامت کا سامنا تھا چرخ ۔۔۔ ہزار شکر تصادم سے بچ کے آیا ہوں

زندگی کی تلخیوں سے ہر انسان "تلخ کام" نظر آتا ہے۔ اور اس تلخ کامی سے نجات کیسے پا سکتے ہیں اسے چرخ صاحب کی خوشباش طبیعت نے یوں پیش کیا

ہے۔

تلخیاں بھی زندگی کا جزو ہیں
چُبھتی رہتی ہیں ببولوں کی طرح
اِن کو خاطر میں نہ لا اے چرخؔ تُو
مُسکرا گلشن میں پھولوں کی طرح

حُسن و شباب کی لطافت و شگفتگی اہلِ نظر کے نظارے پر منحصر ہوتی ہے۔

ترے لطیف بدن پر لباس کی سلوٹ
نظر نظر کو نظارے کا لُطف دیتی ہے
بنا کے خود کو اُبھرتے شباب کا مرکز
ہر اِک سے حسنِ توجہ کی داد لیتی ہے

حُسن یوں مُسکرا کے چلتا ہے
کیف و مستی لُٹا کے چلتا ہے
جیسے بادِ نسیم کا جھونکا
سارے گُلشن پہ چھا کے چلتا ہے

اِس طرح قارئین ان کے اکثر قطعوں میں واقعات و مشاہدات کی عکاسی عمدہ عمدہ اور نادر نادر تشبیہوں میں پائیں گے۔ ع

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چرخؔ صاحب نے رباعیات بھی کہی ہیں۔ رباعیوں میں بھی آپ نے اپنے مشاہدات کو رُومانی انداز اور اچھوتی تشبیہوں میں پیش کیا ہے۔ رُباعی ملاحظہ ہو

جب حسن ترا سوتے میں لہراتا ہے
ہر انگ پہ مستی کا اُبھار آتا ہے
جاگ اُٹھتا ہے اِک پیار جمائی لے کر
ماحول کا ماحول ہی مُسکاتا ہے!

کہتے ہیں حسن وعشق، مشک اور دولت چھپائے نہیں چھپتے۔ چرخ صاحب کا بھی یہی نظریہ ہے۔ یقینی انداز میں فرماتے ہیں۔

رباعی

بلبل تیری چہک کہاں چھپتی ہے   گل چھپتے ہیں، مہک کہاں چھپتی ہے
سو پردوں میں چھپالے جوبن اپنا   جوبن کی یہ لہک کہاں چھپتی ہے

ع ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال

چرخ صاحب بھی اس مقولے کے قائل نظر آتے ہیں۔ رباعی ملاحظہ ہو۔

ناحق تو جوبن پر اتراتا ہے   جوبن جاکر واپس کب آتا ہے
آخر آتی ہے اک رُت ایسی بھی   جب گلشن بھی صحرا بن جاتا ہے

اس مادی دور میں مخلص و بے غرض دوست کا ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ امر محال ہے۔ اس لیے اُن سے اجتناب کی تلقین فرماتے ہیں۔

رباعی

اس دور کے احباب سے دوری اچھی   ارباب غرض سے لاشعوری اچھی
آغاز میں جس کا ہو انجام برا   اے چرخ کہانی وہ ادھوری اچھی

چرخ صاحب نے اپنی غزلوں کے شعروں میں بھی واقعات و مشاہدات کی عکاسی اپنے رومانی اور نشاطیہ انداز میں کی ہے۔ جسے پڑھ کر قارئین یقینی طور پر لطف اندوز ہوں گے۔

نمونہ مشتے از خروارے۔

اُن کے کھلنے ہوئے جوبن کو وہ مرجھا نہ سکا
آنے کو دورِ خزاں سال بہ سال آتا ہے
یوں رُخِ زرد چمک اُٹھتا ہے آنے پہ ترے
جیسے ہولی میں کوئی مل کے گلال آتا ہے
اپنے ہاتھوں کے پلے لوگ جو ہو جائیں خلاف
ان کے اخلاق پہ اے چرخ ملال آتا ہے

مے اُبھر کر جام میں انگڑائیاں لینے لگی
کیسا مدّ و جزر ساقی تیرے میخانے میں ہے
بزمِ دُنیا میں ہیں حسن و عشق یوں جلوہ نما
روشنی ہے شمع میں تو سوز پروانے میں ہے

ہر ادا حُسن کی پُرپیچ و خطر ہوتی ہے
موج جب موج میں آتی ہے بھنور ہوتی ہے
جب وہ مستی میں اُلٹ دیتے ہیں چہرے سے نقاب
کائناتِ دل و جاں زیر و زبر ہوتی ہے

دل تو دل رگ رگ کی باچھیں کھل گئیں
پھول سے چہرے جہاں بھی مل گئے
کھوکھلا پن اور اُس پر سرکشی
بلبلے پانی میں پھر سے مل گئے

یہ میرے چاند کی کرنوں کا فیض ہے اے چرخ
رُخِ رقیب پہ دیکھی ہے روشنی میں نے

فارسی اشعار میں بھی مشاہدات کی جھلک دکھائی دیتی ہے

انکساری نشانِ عظمت است
با تکبّر بہ کس نگاہ مکن
نیست ہر کس شفیق و مخلص چرخ
پس بہ ہر کس تو رسم و راہ مکن

آمدِ تو ولولہ انگیز بود
زندگی از رفتنت خاموش است

فنِ شاعری فنونِ لطیفہ میں سے ہے۔ جناب چرخ نے اسے اپنی باغ و بہار طبیعت سے نہایت دلکش و دلپذیر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کی یہ کاوش بھی مشتاقانِ سخن سے قبول کی سند پائے گی۔

منظوماتِ چرخ

(از محسنِ ادب جناب اکمل جالندھری)

چرخ چنیوٹی کی خوش باش و رنگین مزاج طبیعت نے قطعات۔ رباعیات و غزلیات کے گلستان میں جو گل کھلائے ہیں ان کی خوشبو سے مشامِ جاں معطر ہو رہے ہیں۔ میں قارئین کو اُن کے گلشنِ نظم کی سیر کرانا چاہتا ہوں تاکہ سمن زارِ نظم کے پھولوں کی بُو سے بھی اُن کے مشامِ جاں تر و تازہ ہوں اور انہیں معلوم ہو کہ چرخ صاحب نظم گوئی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ جہاں آپ نے قطعہ اور غزل کے گلکدوں میں بہار آفرینیاں کی ہیں۔ وہاں نظم گوئی میں بھی رعنائیاں اور رنگینیاں بھر دی ہیں۔ آپ نے ایسی نظمیں کہی ہیں جن میں تغزل اور رعنائیوں کی رنگ برنگ کیفیات ملتی ہیں

نظم میں شروع سے آخر تک ایک ہی موضوع کو ہر پہلو سے اُجاگر کرنا ہوتا ہے۔ چرخ صاحب نے مختلف موضوعات پر اپنے قلم کو جنبش دے کر اُن کے ہر پہلو پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ جو کچھ انہوں

نے لکھا ہے۔ اُس پر اُن کی اپنے اخلاق اور رنگین طبیعت کی چھاپ ہے۔

چرخ صاحب نے اوائل عمر دیہات نما شہر میں گذاری ہے۔ بلکہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد آپ کسی گاؤں کے ڈل سکول میں مدرس اول کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ گاؤں سے واقفیت رکھنے کے باعث آپ نے اپنی نظموں کے لیے "گاؤں کی دنیا۔ دہقان کی دنیا۔ پنہاریاں۔ جھٹپٹا۔ ترشح؛ آمدِ بہار۔ سہ وقتِ صبح۔ چودھویں کا چاند" وغیرہ موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور جو کچھ ان موضوعات سے متعلق لکھا ہے۔ کسی ادھوری واقفیت پر بیان نہیں کیا بلکہ پوری واقفیت کی بنا پر نہایت دلکش انداز میں تحریر کیا ہے اور حقیقت کو مناسب الفاظ کا جامہ پہنایا ہے جو اُن کی زندگی کے تجربہ کا نچوڑ ہے اور سرتا پا درست ہے۔ انہی نظموں کی بدولت وہ گورنمنٹ آف انڈیا اور پنجاب سرکار سے نوازے گئے ہیں۔

آپ کی نظموں میں ایک خوبی اور بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی نظمیں دیگر شعرا کی نظموں کی طرح بیجا طور پر طویل نہیں ہوتیں۔ بلکہ آپ مناسب و ضروری طوالت میں اپنی رنگینیٔ بیان سے اُن کے ہر پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔ دہقان کی دنیا، ترشح اور جھٹپٹا وغیرہ کے نظاروں سے صرف دیہاتی زندگی کو ہی لطف اندوز ہونے کا موقعہ مل سکتا ہے۔ اس لیے قارئین کے دل میں بھی گاؤں میں ہونے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔ بمصداق ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

اور جب آپ کی نظم پنہاریاں میں اس شعر پر نظر پڑتی ہے۔ تو دل میں خوشی اور گدگدی کے ساتھ مستی پیدا ہونے لگتی ہے ؎

مُسکراتا ہُوا اندر کا اکھاڑا جاگا   آنکھیں ملتا ہُوا ماحول دلآرا جاگا
لے کے گاگر چلیں پنہاریاں پانی بھرنے   خواب آلود فضاؤں کو شرابی کرنے
نظر آتی تھی جوانی ہی جوانی ہر سُو   گدگداتی تھی نگاہوں کی روانی ہر سُو

ذرّے ذرّے سے محبت کا پیام آنے لگا
تشنگی جس کو ترستی تھی وہ جام آنے لگا

گاؤں کی دُنیا۔ دہقان کی دُنیا۔ دہقان۔ ترشح۔ سرودِ صبح۔ آمدِ بہار اور کرما نظموں کے مطالعہ سے دل میں ذوق و شوقِ عمل پیدا ہوتا ہے اور قدرت کے نظاروں کو دیکھنے کے لئے آزاد و بیدار رہنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ان نظموں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

"دہقان کی دُنیا" ؎ باقی ہے اُخوت کی کہانی بھی ابھی ہے ؛ مہمان نوازی کی نشانی بھی ابھی ہے
دہقان کی دُنیا ہے نمائش سے کہیں دُور ؛ تحسینِ خود آرا و ستائش سے کہیں دُور
تحریصِ عمل دیتی ہے دہقان کی دُنیا ؛ فطرت سے صلہ پاتی ہے انسان کی دُنیا

"دہقان" تن بدن موٹے سے کھدر کی ردا سے ڈھانپ کر۔ خون پسینہ ایک کرنے کو چلا وقتِ سحر
فکرِ سر ما بھی نہیں، احساسِ گرما بھی نہیں۔ محکمِ فطرت پہ ازل ہی سے ہے محکم اپنی جبیں
مستِ صہبائے عمل خاموش سا انسان ہے۔ ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا تسکینِ دہقان ہے

"گاؤں کی دُنیا" ۔ بڑ کے سائے تلے چوپال کا منظر دیکھا ۔ ظلم کے ٹیکے ہوئے دار و رسن دیکھا
دودھ کا دودھ یہاں پانی کا پانی دیکھا ۔ یعنی ہر پنچ کو انصاف کا بانی دیکھا

"ترشح" ۔ کشتِ ارماں کو ترشح سے سہارا آنے لگا ۔ جوشِ رنگ و بو میں تو عاں گیت برسانے لگا
کسان محو ہیں کھیتوں کی آبیاری میں ۔ وہ اس ہے نور کی مدہوش ہراک کیاری میں

"آمدِ بہار" ۔ پتی پتی پہ نئے رنگ کا جوبن آیا ۔ شاخیں لہرائیں کہ پھر گایا ہوا ساون آیا
باچھیں پھولوں کی کھلیں شاخوں پہ کلیاں پھوٹیں ۔ عہدِ سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی نبضیں چھوٹیں

"موسمِ گرما" ۔ تھپیڑے لو کے چلے شعلہ رو ہوئی دُنیا ۔ شرر افشانیٔ خورشید کی بہار آئی
چراغ بزمِ زمستاں بُجھا بُجھا سا ہے ۔ فضا نے لی ہے جُھلستی ہوئی سی انگڑائی

"سرُورِ صبح" ۔ عروسِ صبح فضاؤں کو جگمگاتی ہے ۔ فلک کے مست ستاروں کو نیند آتی ہے
سحر سُناتی ہے جب اپنا نغمۂ رنگیں ۔ رگِ حیات میں بجلی سی دوڑ جاتی ہے

"عزمِ سپاہی" اور "ولولے" یہ دونوں نظمیں بھی اپنی اپنی جگہ پہ خوب ہیں ۔"عزمِ سپاہی"
حبّ الوطنی کی آئینہ دار ہے اور "ولولے" دلوں میں جوش و تہوّر پیدا کرنے والی نظم ہے ۔
اشعار ملاحظہ ہوں :۔

"عزمِ سپاہی" ۔ میں جا رہا ہوں جنگ کے شعلوں سے کھیلنے ۔ آتش فروز اُٹھتے بگولوں سے کھیلنے
میں دُشمنوں کے چھکے چھُڑا کر ہی آؤں گا ۔ اپنے وطن کی آن بچا کر ہی آؤں گا

"ولولے" ۔ مزاجِ دہر ازل سے سکوں پسند نہیں ۔ یہی سبب ہے کہ ہوتے ہیں زلزلے پیدا
ہوا کی موج کا فتنے بھی ساتھ دیتے ہیں ۔ کہ ان کے دل میں بھی ہوتے ہیں ولولے پیدا

مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ "حسنِ ادب" میں آپ اور نظمیں بھی پائیں گے مثلاً

بھگوان کرشن۔ بھگوان رام۔ مہرشی سوامی دیانند۔ مہاتما گاندھی۔ مرا نہرو۔ خیر مقدم سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر ذاکر حسین۔

بھگوان رام، بھگوان کرشن اور سوامی دیانند سے چرخ صاحب کو جو عقیدت ہے، ملاحظہ فرمائیں :۔

"بھگوان رام" ؎ کیوں نہ ہو بھر عاقبت کی فکر سے وہ بے نیاز۔ زندگی قربان کر دے جو تمہارے نام پہ

"بھگوان کرشن" ؎ زیست کا تو جاں ہے میرا کرشن۔ یعنی جان جہاں ہے میرا کرشن

"مہرشی دیانند" ؎ جس سے ہر قوم کی تقدیر بنا کرتی ہے۔ سبق اخلاق کا وہ درس سکھاتا آیا

ہر نظم حقیقت کی مظہر ہے۔ مہاتما گاندھی اور نہرو کی عظمت کا انداز دیکھئے :۔

"مہاتما گاندھی" ؎ باپو نے ہر انسان کو انسان سمجھا۔ ہمدردی ہر فرد کو ایمان سمجھا

انجیل کو گیتا کو قرآں کو اک رنگ دیا۔ سینے سے لگایا انہیں یکساں سمجھا

"مرا نہرو" ؎ نہ پوچھ وسعت پرواز میرے نہرو کی۔ زمانہ سنتا تھا آواز میرے نہرو کی

"سرحدی گاندھی" ؎ خان بابا کی ذاتِ والا صفات۔ محسنِ ہند ہے حقیقت میں

کانگریس کو ملی تھی تقویت۔ اسی بختون کی رفاقت میں

"ڈاکٹر ذاکر حسین" ؎ پاسبانِ حریت تھا آبروئے ہند تھا۔ ایک سچا رہنما تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

اس کے ہاتھوں میں امانت تھی وطن کی زندگی۔ اک امین باوفا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

بخیالِ طوالت اس تحریر کو ختم کرتا ہوں، ورنہ جناب چرخ کے کلام پر طویل تبصرہ کی گنجائش ہے :۔

قطعات

بھول جاتے ہیں دوستوں کے نشاں
لے کے جو اپنی ہوا چلتے ہیں
منزلیں چومتی ہیں اُن کے قدم
جو توکّلِ بخدا چلتے ہیں

ہے یہ عیش و نشاط کا قصّہ
زندگی داستانِ مرگ نہیں
یہ بہاروں کا ایک تحفہ ہے
کوئی پت جھڑ کا خشک برگ نہیں

کچھ اس ادا سے جوانی تری کھلے مہکے
بہاریں جھومنے آئیں تری جوانی کو
شکن شکن تیری اُبھرے تو اس طرح اُبھرے
کہ جیسے موج تڑپ کے اُٹھے روانی کو

اُس مہکتے ہوئے بدن پہ یوں
پیچ کھا کے لپٹ رہا ہے لباس
کُنڈلیاں جس طرح لگائے ناگ
یا کے چندن کے پیڑ کی بُو باس

نرم و نازک سی اُنگلیاں اُن کی
یوں کشیدے پہ تیز چلتی ہیں
سبزہ زاروں میں جس طرح اے چرخ
ہرنیاں کودتی اُچھلتی ہیں!

اُن کے آتے ہی غم بھری گھڑیاں
مسکراہٹ میں یوں بدلتی ہیں
جیسے سورج طلوع ہوتے ہی
سات رنگوں میں کرنیں ڈھلتی ہیں

سرد مہری کے باوجود اے دوست
رچ گئی دل میں یوں تری خوشبو
برف کی تہ میں جم گئے جیسے
اک پہاڑن کے گرم گرم آنسو

یوں مرے دل کے اُجڑے گوشے میں
اُن کے آنے کی آس بیٹھی ہے
جیسے بے برگ و بار ٹہنی پر
ایک چڑیا اُداس بیٹھی ہے

یوں بہکتے ہیں زندگی کے قدم
جیسے بن کر شراب آئی ہو
یا حنا کو بلا تجلی دے کر
کوئی عصمت مآب آئی ہو

تنہا زینے میں حسن کا ملنا
کتنا رومان خیز ہوتا ہے
نظریں ٹکتی ہیں، پاؤں رکتے ہیں
ہر نفس تیز تیز ہوتا ہے

لوچ کھاتا ہوا بدن تیرا
مسکراتی ہوئی تری رگ رگ
تیری تصویر کس طرح کھینچوں؟
سوتے بیٹھے کے زاویے ہیں الگ

کیا طلسمِ شباب ہے اُن کا
شوخ ہو کر بھی شرمگیں ہیں وہ
ہم نے ہر زاویے سے دیکھا ہے
وہ حسیں ہیں بہت حسیں ہیں وہ

بات کرتے ہیں حاکموں کی طرح
نوجوانی کی شان رکھتے ہیں
یہ حسیں لوگ، زندگی کی قسم
زندگی کو جوان رکھتے ہیں

کبھی آئے ہیں وہ بہ نفسِ نفیس
اور کبھی اُن کی یاد آئی ہے
زندگی یوں بھی مسکرائی تھی!
زندگی یوں بھی مسکرائی ہے

ہماری عرض نہ مانی کسی نے پل چمن بھی
تمہارے حکم کے تابع ہیں، رات بھی، دن بھی
ہمارا بخت کہ ممکن بھی غیر ممکن ہے
تمہارے بس میں ہیں ممکن بھی، غیر ممکن بھی

نسترن دیکھی ہے، اندازِ سمن دیکھا ہے
ہم نے ہنستا ہوا ماحولِ چمن دیکھا ہے
جس کو چھونے سے رگ و پے میں جوانی دوڑے
وہ لطافت بھرا اُس بُت کا بدن دیکھا ہے

کبھی حیا کی متانت، کبھی ادا کا اُبھار
تری جوانی بھنور میں جھکولے کھاتی ہے
کہ جیسے سامنے آکر کوئی حسیں دُلہن
کبھی گراتی ہے گھونگھٹ کبھی اُٹھاتی ہے

مہکی مہکی جب وہ زُلفیں کُھل گئیں
ایک خوشبوؤں کا بادل چھا گیا
مستیاں برسیں کچھ اس انداز سے
گنگناتا جیسے ساون آگیا

ستم تو دیکھو کہ جذبات کو ہوا دینے
حسین لوگ قریب آ کے بیٹھ جاتے ہیں
کچھ اِس ادا سے دِکھاتے ہیں حسن کے جلوے
کہ ہم سمجھتے ہوئے بھی فریب کھاتے ہیں

جوانیوں کے تلاطم سے بچ کے آیا ہوں
ہر ایک موجِ تبسّم سے بچ کے آیا ہوں
قدم قدم پہ قیامت کا سامنا تھا جرمؔ
ہزار شکوہ، تصادم سے بچ کے آیا ہوں

آنسوؤں کی فضا اُبلتی ہے
ہجر کی رات آگ اُگلتی ہے
آج شبنم کے رُوپ میں آ کر
چاندنی دُھوپ بن کے جلتی ہے

بام و در وقفِ یاس رہتے ہیں
رنج و غم آس پاس رہتے ہیں
جب شبستاں میں تم نہیں ہوتے
آئینے بھی اُداس رہتے ہیں

شبِ فرقت یہ میں نے دیکھا ہے
حشر ڈھاتے ہیں غم کے مارے بھی
جب یہ روتے ہیں، ساتھ ساتھ ان کے
سسکیاں بھرتے ہیں ستارے بھی

ثواب کرنے چلے تھے گناہ کر بیٹھے
بہاروں پہ ہموں کی نگاہ کر بیٹھے
جہانِ دل کو تو لُٹنا تھا، لُٹ گیا، لیکن
ہم اپنا حسنِ تقدس تباہ کر بیٹھے

اٹک گئی دل میں یوں تری تصویر
میری نظروں کی ایک دستک پہ
جیسے سجتا ہے ٹیکا چندن کا
اک پجارن کے کِھلتے مستک پہ

مسکراتے ہوئے حسین چہرے
مسکراتے رہیں قیامت تک
ہو نہ ہو ان سے رسم و راہ، مگر
یاد آتے رہیں قیامت تک

اتفاقاً ملاپ ہونے پہ
دو جواں دل کچھ اس طرح دھڑکے
جیسے برہا کے آنسوؤں سے چرخ
پیار کی آگ اور بھی بھڑکے

جل پری کے حسین دھوکے میں
تیرے قدموں میں موج موج آئی
غلغلہ یوں اٹھا سمندر میں
جیسے چنگیز خاں کی فوج آئی

ان بتوں پر شباب آتے ہی
یوں اداؤں کی کونپلیں پھوٹیں
آمدِ انقلاب سے جیسے
قیدی قیدی کی ہیڑیاں ٹوٹیں

کبھی بھرتے ہیں روپ پھولوں کا
کبھی غنچہ صفت وہ آتے ہیں
کبھی ملتے ہیں مسکرا کے مجھے
وہ کبھی مل کے مسکراتے ہیں

یوں جوانی پہ آ رہی ہے بہار
آم پر جیسے بور آتا ہے
انکھڑیوں سے چھلک رہی ہے شراب
کیف و مستی کا دور آتا ہے

کھلتے کھلتے مستک ملے وہ آج مجھے
آج کا دن بہت حسین دن ہے
آج تک جتنے دن بھی گزرے ہیں
سب دنوں سے یہ بہترین دن ہے

جب مری گلبدن نے چھلکایا
سرخ انگلیوں میں جام شراب
تمتماہٹ فضا میں یوں ابھری
جیسے لاوا اگل رہا ہو شباب

یوں مری ڈبڈباتی آنکھوں میں
تیرتا ہے ترا کنول سا بدن
جام بلور میں تھرکتی ہے
جس طرح کیف زا شراب کہن

آج کی صبح بھی ہے صبحِ بہار
شام بھی آج شام ہے ساقی!
غمِ دوراں پہ کیوں نہ چھا کے چلوں
میرے ہاتھوں میں جام ہے ساقی

باغ میں سرو و چمن اُلجھتے ہیں
یعنی سرو و سمن اُلجھتے ہیں
ہم تم اُلجھیں مگر بہ شوقِ وصال
جیسے گنگ و جمن اُلجھتے ہیں

مجھ سے پہلو تہی نہیں اچھّی
میرے پہلو نواز بن جاؤ
ایک اِک تان پہ میں ناچوں گا
میرے نغموں کا ساز بن جاؤ

پیار کا لطف جب ہے، تم بھی کبھی
آفتاب آفریں کرن بھیجو
میرے شبنم بھرے گلوں کے عوض
مسکراتا ہُوا چمن بھیجو!

دل ہے مدفن پرانی یادوں کا
باسی پھولوں کا ہار ہو جیسے
حسرتیں یوں لپیٹ کے روتی ہیں
زندگی اک مزار ہو جیسے

حسرتیں بیٹھی ہیں سر تھامے ہوئے
سلسلہ بگڑا ہوا ہے بات کا
زندگی خاموش ہے کچھ اس طرح
جیسے سناٹا ہو آدھی رات کا

عمر بھر کے گناہ دھلتے ہیں
ایک جام شراب پینے سے
اُس کی رحمت کو دیکھ کر انداز
شیخ پینے لگا قرینے سے

ہے یہ پیری تمہارے غم کے طفیل
تم مصنف ہو اِس کہانی کے
تم جو چاہو تو پھر سے لوٹ آئیں
دن اُمنگوں بھری جوانی کے

ریشمیں ریشمیں سی زلفوں میں
ناچتی پھر رہی ہے یوں خوشبو
ایک شاداب و سبز وادی میں
جو کڑی جس طرح پھرے آہو

نشے آنکھوں میں یوں لہکتے ہیں
کالے ہرنوں کی ڈار ہو جیسے
یوں چمکتا ہے پھول سا چہرہ
آفتابِ بہار ہو جیسے

تیرے لطیف بدن پہ لباس کی سلوٹ
نظر نظر کو نظارے کا لطف دیتی ہے
بنا کے خود کو اُبھرتے شباب کا مرکز
ہر اک سے حسنِ تموّج کی داد لیتی ہے

میرے آتے ہی وہ چونک اُٹھے بھری محفل میں یُوں
جیسے بے پردہ نہاتے میں نے دیکھا ہو انہیں
یا کسی چڑھتی ندی کے پاس جوگن کی طرح
پیار کی لہریں لٹاتے میں نے دیکھا ہو انہیں

تم مرے قرب سے گزرو تو کچھ ایسے گزرو
لوگ سمجھیں کہ ابھی ٹوٹا ہے رشتہ اپنا
یہ نہ ہو جیسے کہ ہم تم کبھی واقف ہی نہ تھے
سمٹ کے رہ جائے سراسیمہ فرشتہ اپنا

آہ دکھلا گئی اثر اپنا
ہو گیا شوق بارور اپنا
ہم سفر وہ بنے ہیں قسمت سے
ختم یارب نہ ہو سفر اپنا

کل بھی آ جائے گا وعدہ تو کرو
ہم سے ملنے کا ارادہ تو کرو
خود بدل جائے گا ماحول کا رنگ
شغلِ سرمستیٔ بادہ تو کرو

اُن کی ہنستی ہوئی نگاہیں آج
دے گئیں پیار کا سلام مجھے
مسکرائے نہ کیوں مرا ماحول
زیست کا مل گیا پیام مجھے

اُن کی پیشانی پہ بکھری جو اُداسی ہے
سات رنگوں میں مسکراتی ہے
میری ہنستی ہوئی نگاہوں کو
غم کی دنیا ہی بھول جاتی ہے

حسن یوں مسکرا کے چلتا ہے
کیف و مستی لٹا کے چلتا ہے
جیسے بادِ شمیم کا جھونکا
سارے گلشن پہ چھا کے چلتا ہے

بادلوں میں ہے چاند پونم کا
روشنی چھن رہی ہے چلمن سے
رنگ و نکہت کا کارواں ہو رواں
بے نیازانہ، جیسے گلشن سے

تلخیاں بھی زندگی کا جزو ہیں
چبھتی رہتی ہیں ببولوں کی طرح
ان کو خاطر میں نہ لائے چرخ تو
مسکرا گلشن میں پھولوں کی طرح

زیرِ لب جب وُہ مسکراتے ہیں
شمع جلتی ہے کامرانی کی
جب وُہ گاتے ہیں پیار کے نغمے
مُسکراتی ہے لَو جوانی کی

جب وُہ اُٹھتی ہیں مے فشاں نظریں
گُل فضا مے گسار ہوتی ہے
زندگی کے قدم بہکتے ہیں
مست ہر رہگذار ہوتی ہے

تُم کبھی میری طرف بھُول کے دیکھو تو سہی
سلسلہ چھائیگا یادوں کا گھٹا کی صُورت
بے وفائی کی لکیریں نہ اُبھر پائیں گی
برق کے رُوپ میں کوندے گی وفا کی صُورت۔

یہ حسیں لوگ رَوِش اپنی جُدا رکھتے ہیں
چاہنے والوں کو محرومِ وفا رکھتے ہیں
پیار کی بات وُہ سُنتے ہیں بصد ناز و ادا
بات ٹھکراتے نہیں، پاسِ حیا رکھتے ہیں

شگفتگی تیرے جوبن کی اِن کے دم سے ہے
ترے شباب کو نظریں جوان رکھتی ہیں
بس اک اشارے سے کہتی ہیں مدعا دل کا
یہ بے زبان نہیں ہیں، زبان رکھتی ہیں

وہ جہاں بیٹھے وہیں ڈالی شگوفوں کی بنا،
رونقیں چھوڑ کے اُٹھے وہ جہاں سے اُٹھے
اُن کی رنگین جوانی کا یہ عالم، واللہ
گلستاں ہنستے ہوئے حسنِ جواں سے اُٹھے

کون برگشتہ مزاج آج چمن سے گزرا
پھول کے ماتھے پہ ہلکی سی شکن اُبھری ہے
سہما سہما سا نظر آتا ہے حسنِ فطرت
کانپتی کانپتی سورج کی کرن اُبھری ہے

وہ مسکرا کے ملے ہیں، شگون اچھا ہے
نظر ملا کے ملے ہیں، شگون اچھا ہے
جو میرے سائے سے بھی دور دور رہتے تھے
وہ پاس آ کے ملے ہیں، شگون اچھا ہے

چاند سے متعلّق

چاند کے کیا حسیں فسانے تھے
کیف زا، دلنشیں ترانے تھے
چاند پر جا کے ہم نے دیکھ لیا
دور کے ڈھول ہی سہانے تھے

چاند کی وضع قطع کچھ بھی سہی
ذوقِ شعری رہے گا پائندہ
چاند اور چاندنی کی تشبیہیں
تا قیامت رہیں گی تابندہ

دورئ ماہ کا نہ ذکر کرو
چاند اب اک قدم کی زد میں ہے
اب تو مرّیخ و زہرہ کی دنیا
اہلِ ہوش و خرد کی حد میں ہے

چاند کی سرزمیں بھی جگمگا اُٹھی
جب ہمارے جواں وہاں اُترے
ٹوٹ کر رہ گیا جمود و سکوت
جب خلا کے حساب داں اُترے

اہلِ عالم تو کیا، فرشتے بھی
اہلِ ہمّت کی داد دیتے ہیں
جب یہ اُڑتے ہیں آسمانوں پر
اُن کے قدموں کو چوم لیتے ہیں

"آج کا پندرہ اگست"

دورِ محکومیت مٹا تھا کبھی
کبھی اُبھری تھی حرّیت کی کرن
بن گئی تھی فضا نشاط آگیں
مٹ گیا تھا نشانِ رنج و محن

جن لبوں پہ کبھی تبسّم تھا
اُن لبوں پر اب آہ و زاری ہے
رہبرانِ وطن بنے رہزن
چار سُو لوٹ مار جاری ہے

صاحبِ اقتدار ہیں جتنے
دے رہے ہیں تسلّیاں جھوٹی
بھاڑ میں جائیں ہموطن، وہ تو
بھر رہے ہیں تجوریاں اپنی

روک دو ہاتھ سربراہوں کا
میرے مقروض دیش کے بچّو!
دے چلے ہیں یہ بار قرضے کا
آنے والی ہزار نسلوں کو

آڑ لے کر وطن پرستی کی
جھوٹے وعدوں سے وہ نہ بہکائیں
چھوڑ دیں شاطرانہ چالوں کو
ہم غریبوں پہ رحم فرمائیں

"یومِ جمہور"

یومِ جمہور! تیرے آنے پہ
ناچ اُٹھے ہیں مسرتوں کے پیام
اِن اُجالوں میں ظلمتیں تو نہیں
سوچتے ہیں مرے وطن کے عوام

جگمگاتا ہے وقت کا چہرا
اپنے رُخ پہ نہیں ہے موجِ نور
جامِ جمہوریت تو پیتے ہیں
لیکن اس میں نہیں ہے کیفِ سرور

بے بسوں پہ جہان ہنستا ہے
جھونپڑی کس طرح ہو رشکِ محل؟
حسرتیں دم جو توڑیں گھٹ گھٹ کر
زندگی کیوں نہ ہو شکارِ اجل؟

اپنے حسرت بھرے مقدر کا
اس طرح ہم مذاق اُڑاتے ہیں
خود ہی روتے ہیں وقت کا رونا
اور پھر خود ہی مسکراتے ہیں

"دیوالی سے متعلق"

جل رہے ہیں دیے منڈیروں پہ
ہو رہا ہے کرم اندھیروں پہ
تم جو بن کر کرن کرن آؤ
داغِ دل بھی ہنسیں سویروں پہ

مسکراتی ہوئی چلی آؤ
چھنچھناتی ہوئی چلی آؤ
دھن کی دیوی ہو، تم مرے گھر میں
دھن لٹاتی ہوئی چلی آؤ

دل سلگتا ہے، داغ جلتے ہیں
آرزوؤں کے باغ جلتے ہیں
روز دیوالی، غمزدہ گھر میں
آنسوؤں کے چراغ جلتے ہیں

جس کو کہتے ہیں لوگ دیوالی
اونچے آدرش کی نشانی ہے
باپ دادوں کے پاک جیون کی
ایک عظمت بھری کہانی ہے

"آج کا دور"

آج کا دور حسینوں کی طرح نازک ہے
ہم کو ایک ایک قدم پھونک کے رکھنا ہوگا
ایک تلخی سی فضا یہ ہے مسلط ایسی
انگلیں کو بھی بہت سوچ کے لکھنا ہوگا

آج کے دور کی بیدار فضائیں ایسے
صورت زیست نگاہوں سے ہوئی ہی اوجھل
جیسے میلے میں رفیقوں کے بچھڑ جانے پر
ڈھونڈنے والوں کی ہوتی ہے طبیعت بوجھل

آج کا دور تو اخلاق سے بے بہرہ ہے
آج کے دور میں اخلاق کی توقیر نہیں
جس میں تہذیب و تمدن کا جھلکتا ہو شعور
اپنے پیش نظر ایسی کوئی تصویر نہیں

وقت کے ساتھ جو چلتا نہیں باعزم صمیم
وہ بچھڑ جاتا ہے، کوسوں ہی بچھڑ جاتا ہے
جو اٹھاتا ہے قدم سوچ سمجھ کر اے چرخ
وہ نہ گرتا ہے نہ لغزش ہی کہیں کھاتا ہے

"دیپ مالا"

آج ہے نُور اپنے جوبن پر
چار سُو دیپ جگمگاتے ہیں
رُوپ دُلہن کا بھر رہی ہے فضا
سولہ شنگار مسکراتے ہیں

جلوہ فرما کہیں ہیں قندیلیں
ضَو فشاں ہے کہیں دیوں کی قطار
کروٹیں لے کوئی شمعیں جیسے
یُوں اُبھرتی ہے روشنی کی بہار

ظلمتوں کا کہیں بھی نام نہیں
آج کی رات آفتابی ہے
دور آیا ہے دیپ مالا کا
آج جلووں کی بے حجابی ہے

ہر مکاں کی منڈیر پر دیپک
رقص میں لا رہے ہیں جلووں کو
جیسے چھپتا ہے رُوپ گوری کا
یُوں وہ چمکا رہے ہیں جلووں کو

آج کی شب ہے لکشمی پُوجن
اپنے جیون کو با صفا کر لیں
اپنے مالک کو یاد کر کے حریرخ
ہم مُرادوں سے جھولیاں بھر لیں

"بچّے کی ولادت پر"

کِس کنول نے دکھائی ہے صُورت ۔ گھر کا ماحول مسکرایا ہے
سب کے چہرے کھلا دئیے اس نے زندگی کی بہار لایا ہے

ہر کلی نے بجائی شہنائی اس کا انداز سب کو پیارا ہے
زندگی آج ناچتی آئی! یہ ستارا، حسین ستارا ہے
آج جھولے جھلا رہی ہے فضا والدین اس پہ ناز کیوں نہ کریں؛
لوریاں دے رہی ہے پروائی: زندگی کا یہی سہارا ہے

اس کے ہونٹوں کے اک تبسّم پر کتنا پیارا ہے رنگ رُوپ اس کا
سو بہاریں نثار ہوتی ہیں یہ کھلونا تو سب کو بھاتا ہے
جیسے سُورج کی ضوفشاں کرنیں جو بھی آتا ہے، چُومتا ہے اِسے
صبحدم آشکار ہوتی ہیں سب کی آنکھوں میں مُسکراتا ہے

عمر اس کی دراز ہو اے چرخ مُسکراتا رہے چمن کی طرح
یہ چمکتا رہے زمانے میں چاند تاروں بھرے گگن کی طرح

"بچّی کی وفات پر"

بمقام لکھنؤ
۲۸ رفروری سنہ ۴۹ء

"چند آنسو"

عقل حیران ہے خاموش ہے دل کی دُنیا ۔ ڈبڈباتی ہیں نگاہیں، یہ تماشا کیا ہے
ہوش کو ہوش نہیں، سانس ہے اُکھڑی اُکھڑی ۔ لب پہ آنے لگیں آہیں، یہ تماشا کیا ہے

گھر تھا روشن مرا جس نورِ نظر کے دم سے ۔ دوپہر ایک بجے چھن گیا نور آنکھوں کا
رُوح کو چین تھا اور دِل کو تھی ٹھنڈک جس سے ۔ لُٹ گیا موت کے ہاتھوں وہ سُرور آنکھوں کا

وائے قسمت کہ پشیماں ہوں کیئے پر اپنے ۔ مجھ پہ جو فرض تھا لازم وہ ادا کر نہ سکا
مَیں نے دنیا کے بکھیڑوں سے نہ پائی فرصت ۔ تیرے جینے کی دوا اور دُعا کر نہ سکا

لاڈلی، میٹھی، محبّت بھری باتیں تیری ۔ یاد آتی ہیں مجھے خُون رُلانے کے لئے
تجھ کو معلوم ہے بچّی، میری دولت کیا ہے ۔ چند آنسو جنہیں لایا ہوں چڑھانے کیلئے

یاد باقی ہے ہر دل میں رہے گی باقی ۔ مجھے رو رو کے فسانہ تیرا کہنا ہوگا
باپ سے، ماں سے، بہن بھائی سے پُوچھ اے بچّی! عمر بھر جن کو پریشان ہی رہنا ہوگا

رُباعیات

جلووں سے ترے فضا چمک جاتی ہے
ہر موجِ نسیم راگنی گاتی ہے
ہنگامِ سحر، تری قدم بوسی کو
سورج کی کرن لپک لپک آتی ہے

دوشیزگیٔ حسن نکھر آئی ہے
تصویرِ جمال اور اُبھر آئی ہے
رنگین سے گال، اُن پہ سنہری زلفیں
خورشید کی دُنیا ہی اُتر آئی ہے

کیوں اب بھی وہ اندازِ سلف ہیں ساقی
آئینِ مساوات تلف ہیں ساقی
تخصیص یہ زیبا نہیں دیتی تجھ کو
سب، میرے سوا، جام بکف ہیں ساقی

ناحق تو جوبن پر اتراتا ہے
جوبن جاکر واپس کب آتا ہے؟
آخر آتی ہے اک رُت ایسی بھی
جب گلشن بھی صحرا بن جاتا ہے

پہنچا کے سرِ اوج، گرایا مجھ کو
تقدیر کا انداز دکھایا مجھ کو
صد حیف بہاروں کے کھلے موسم میں
ہنستے ہوئے چہروں نے رُلایا مجھ کو

جب حسن ترا سوتے میں لہراتا ہے
ہر انگ پہ مستی کا اُبھار آتا ہے
جاگ اُٹھتا ہے اک پیار جمائی لے کر
ماحول کا ماحول ہی مسکاتا ہے

وہ آنکھ گلابی سی جو چھلکاتی ہے
دوشیزگی گلشن کی بہک جاتی ہے
ماحول مچلتا ہے شرابی ہو کر
اک ایک کلی لے کے سبو آتی ہے

بلبل تیری چہک کہاں چھپتی ہے؟
گُل چھپتے ہیں، مہک کہاں چھپتی ہے؟
سَو پردوں میں چھپا لے جوبن اپنا
جوبن کی یہ لہک کہاں چھپتی ہے؟

مےنوش کا پیغام عوامی نِکلا
عرفان کا انداز دوامی نکلا
کشکول سے آتی ہے مئے ناب کی بُو
درویش بھی میکشی کا حامی نِکلا

منفی میں جو اظہار ہوا کرتا ہے
اثبات کا شہکار ہوا کرتا ہے
اِنکار پہ اِنکار انہیں کرنے دو
اِنکار میں اقرار ہوا کرتا ہے

گُلشن میں اُس بُت نے اُلٹا جو نقاب
شاخوں شاخوں پھیلی تنویرِ شباب
حیرت سے کلیوں نے منہ کھول دیئے
بن پایا پھولوں سے اُس کا نہ جواب

شانوں پر بل کھاتی ہے زُلف تری
ناگن بن بن جاتی ہے زُلف تری
خود تو اُڑ اُڑ کر ہم سے چھیڑ کرے
ہم چھیڑیں، شرماتی ہے زلف تری

تنویر ہی تنویر ہے جوبن تیرا
منہ بولتی تصویر ہے جوبن تیرا
صدقے تیرے، جاگی ہوئی قسمت والے!
کس خواب کی تعبیر ہے جوبن تیرا

اِس دور کے احباب سے دُوری اچھّی
اربابِ غرض سے لاشعوری اچھّی
آغاز حسیں جس کا ہو، انجام بُرا
اے چرخ! کہانی وہ ادھوری اچھّی

میں جھوٹ کو پردھان بناتا کیسے
دادِ اہلِ زمانہ سے میں پاتا کیسے
چھل بل سے رہی کوئی نہ رغبت اے چرخ
جینے کا سلیقہ مجھے آتا کیسے

جب سرِ بام وہ خورشید جمال آتا ہے
ذرّے ذرّے پہ قیامت کا جلال آتا ہے

پھول مسکاتے ہیں لہراتی ہے ٹہنی ٹہنی
فصلِ گل آتے ہی ہر شے پہ جمال آتا ہے

وہ جنم دن یہ بلاتے ہیں ہمیشہ مجھ کو
ہر نیا سال باندازِ وصال آتا ہے

کیوں ترے ہونٹ مجھے دیتے ہیں منفی میں جواب؟
میرے ہونٹوں پہ پیر ردہ کے سوال آتا ہے

جب سے الی کہنی آجاتا ہے ذریعہ مجھے
اُس کی بخشی ہوئی نعمت کا خیال آتا ہے

اُن کے کھلتے ہوئے جوبن کو وہ مرجھا نہ سکا
آنے کو دورِ خزاں سال بہ سال آتا ہے

مجھے جچتی ہی نہیں اور کسی کی صورت
جب خیال آتا ہے تیرا ہی خیال آتا ہے

تارے گنواتی ہیں پھر ہجر کی کالی راتیں
جب مجھے یاد کوئی زہرہ جمال آتا ہے

یوں رخِ زرد چمک اٹھتا ہے آنے پہ ترے
جیسے ہولی میں کوئی لے کے گلال آتا ہے

اپنے ہاتھوں کے پلے لوگ جب ہو جائیں خلاف
اُن کے اخلاق پہ اے چرخ ملال آتا ہے

غزل

ہر نشانے کا اثر بھی دیکھتے تو بات تھی
داغِ دل، زخمِ جگر بھی دیکھتے تو بات تھی

خوش نصیبوں کی اگر شامیں سہانی بھی تو کیا
غم کے ماروں کی سحر بھی دیکھتے تو بات تھی

سرسری نظروں سے دیکھا جب بھی دیکھا آپ نے
مسکرا کر اک نظر بھی دیکھتے تو بات تھی

ہم بھی تو بیٹھے ہوئے تھے محفلِ اغیار میں
والہانہ تم اُدھر بھی دیکھتے تو بات تھی

شبنمی غنچوں کی آب و تاب جو دیکھی تو کیا
میری آنکھوں کے گہر بھی دیکھتے تو بات تھی

دل کے آئینے پہ تو پڑتی رہی اُن کی نظر
وہ مرا حُسنِ نظر بھی دیکھتے تو بات تھی

جبکہ رخ وہ شاہی محل کی بن گئے رونق تو کیا
ہاں مرا سنسان گھر بھی دیکھتے تو بات تھی

غزل

ہو گئے زیر و زبر دل بھی جگر بھی ساقی
کم قیامت سے نہیں تیری نظر بھی ساقی

چاندنی رات میں ہیں ساغرِ مے نور فشاں
آج مل بیٹھے ہیں خورشید و قمر بھی ساقی

تشنہ لب بھی ہیں یہاں جام بکف بھی ہیں یہاں
ہے یہاں شام کے پہلو میں سحر بھی ساقی

آج اُس بُت کی نگاہیں ہیں حریمِ دل پہ
آج لُٹنے کو ہے اللہ کا گھر بھی ساقی

شیخ و زاہد درِ میخانہ پہ آ بیٹھے ہیں
اک نگاہِ غلط انداز اُدھر بھی ساقی

زاہدِ خشک بھی آ نکلا ہے بُتخانے میں
ہے فدا کفر پہ ایمان کا سر بھی ساقی

جام بخشا ہے تو کر تیرخ پہ احسانِ مزید
ڈال دے مست نگاہی کا اثر بھی ساقی

غزل

بے خودی میں ہے نہ وہ پی کر سنبھل جانے میں ہے
لطف پائے یار پر جو لغزشیں کھانے میں ہے

تیرے وعدے، تیری یادیں، تیرے نغمے، تیرے خواب
حسن سے بھرپور دولت میرے کاشانے میں ہے

ساغر و مینا میں لہراتی ہے ہر موجِ شراب
اک جوانی کا تلاطم آج میخانے میں ہے

بزمِ دنیا میں ہیں حسن و عشق یوں جلوہ نما
روشنی ہے شمع میں تو سوز پروانے میں ہے

مے کی اک اک بوند سے طوفانِ مستی ہے عیاں
کس کی مے بار انکھڑیوں کا عکس پیمانے میں ہے

نور کی بارش ابھی ہونے دے تھوڑی دیر اور
اک ذرا سی دیر ہی تو رات ڈھل جانے میں ہے

لاکھ فطرت نے دکھائی برق کی چشمک زنی!
اس میں وہ شوخی کہاں جو تیرے شرمانے میں ہے

جان بھی، دل بھی، جگر بھی، آرزوئے وصل بھی
ان کے پیش اپنا سبھی کچھ آج نذرانے میں ہے

مے ابھر کر جام میں انگڑائیاں لینے لگی
کیسا معجزہ ساقی تیرے میخانے میں ہے

چرخ میں نا آشنا ہوں ہجر کے ماحول سے
وصل کا رنگین پہلو میرے افسانے میں ہے

غزل

ہر ادائے حسن کی پُر پیچ و خطر ہوتی ہے
موج جب موج میں آتی ہے بھنور ہوتی ہے

جانے کون ان کو سُنا جاتا ہے دُکھڑا اپنا
آنکھ ہر پھول کی تر وقتِ سحر ہوتی ہے

دل لگانے کی تو ہوتی ہے فقط خود کو خبر
دل کے لُٹنے کی زمانے کو خبر ہوتی ہے

کہکشاں رشک کرے جس کو فرشتے چومیں
میرے محبوب کی وہ راہگزر ہوتی ہے

پوچھنے آئے ہیں وہ آج ستم کی تشریح
بارشِ لطف باندازِ دِگر ہوتی ہے

پھول ہی پھول بکھرتے ہیں، یہ اُٹھتی ہے جدھر
کتنی گلریز حسینوں کی نظر ہوتی ہے

جب وہ مستی میں اُلٹ دیتے ہیں چہرے سے نقاب
کائناتِ دل و جاں زیر و زبر ہوتی ہے

آنکھ ملتے ہی بدل جاتی ہے کیفیتِ دل
اک نظر یار کی کیا زود اثر ہوتی ہے

اُس پہ کُھل جاتے ہیں درِ خلدِ بریں کے اے حیرتؔ
جس گنہگار پہ رحمت کی نظر ہوتی ہے

غزل

پھاگ کھیلے گا جب شباب اُن کا
خود اُٹھ جائے گا حجاب اُن کا

میری آنکھیں ہیں اُن کے جلوے ہیں
چھا گیا زندگی پہ خواب اُن کا

کیوں نہ جوبن کرن کرن پھوٹے؟
آفتاب اُن کا، ماہتاب اُن کا

اُن کی مست انکھڑیاں جو لہرائیں
پانی بھرنے لگی شراب اُن کا

آج رنگینیوں میں ڈوبا ہے
ہر سوال اُن کا، ہر جواب اُن کا

دیکھ کر اُن کی سُرخی رُخسار
مُنہ لگا چُومنے گلاب اُن کا

جس طرح راہیں مہک مہک اُٹھیں
پھُول برسا گیا شباب اُن کا

غزل

ہم تو ایسے بھی خواب آئے ہیں
شب کو وہ بے حجاب آئے ہیں

بے نقابی کا پردہ رہ جاتا
آپ کیوں بے نقاب آئے ہیں

انگ انگ اُن کا جھُومتا ہے یُوں
جیسے پی کر شراب آئے ہیں

ساتھ دِل کے بدل گئیں نظریں
دو رُخی انقلاب آئے ہیں

اُن کی محفل سے جس طرح ہم اکثر
بے سوال و جواب آئے ہیں

۲ دو غزلیں

نیازِ عجز کی دُنیا نثار کی مَیں نے
سِکھائے حُسن کو اندازِ دلبری مَیں نے
مِرا نصیب، مَیں اک پل بھی مسکرا نہ سکا
اگرچہ دیکھی ہے ہر دم شگفتگی مَیں نے
کبھی نہ تھا وہ مسرّت کا دَور مجھ کو بھی
اُداس اُداس گزاری ہے زندگی مَیں نے
تمام رات سسکتے رہے ستارے بھی
غم و الم کی کہانی جو چھیڑ دی مَیں نے
اِدھر وہ آئے، اُدھر موت آگئی سر پر
بس ایک لمحہ بھی دیکھی نہ زندگی مَیں نے
خدا تو جلووں کو مستور کر کے بیٹھا تھا
خدا کے جلووں پہ ڈالی ہے روشنی مَیں نے
یہ میرے چاند کی کرنوں کا فیض ہے آخر
رُخِ رقیب پہ دیکھی ہے روشنی مَیں نے

مَیں تیرے نام کی مالا تو جپوں، نام نہ لوں؟
یہ بھی کیا خوب کہ محسن کا مَیں چرچا نہ کروں
مہرباں آج ہوئے مجھ پہ وہ اک عمر کے بعد
اب تمنّا ہے کہ دو چار برس اور جیوں
جب تیرے غم سے جھلکتی ہے مسرّت کی کرن
کس لیے پھر مَیں تیرے غم کی تمنّا نہ کروں
آج پینے کا ارادہ ہے، پلا دے ساقی!
پھر ملے یا نہ ملے، پھر مَیں پیوں یا نہ پیوں
بھولیں میں اُنہیں دل دیکھے پریشاں ہوں بہت
اب جو لوٹ آئے تو پھر اس بُتِ کافر کو نہ دوں
غرضِ مطلب ہو تو کہتے ہیں کس انداز کے ساتھ
میری مرضی ہے، مَیں تیری بات سنوں یا نہ سنوں
سوچتا ہوں کہ اشارے تو اکارت ہی گئے
کُھل کے بات اُن سے کہوں، چرخ کہ گھٹ گھٹ کے مروں

غزل

اتفاقاً راہ میں وہ مل گئے
پیار کے غنچے اچانک کھل گئے

جلوتیں آ کر قدم لینے لگیں
آپ جب خلوت میں مجھ کو مل گئے

تیرے آنے سے بہاریں آ گئیں
زخم بھی پھولوں کی صورت کھل گئے

رنگ لایا عشق میں رونا مرا
ریشمیں آنچل کسی کے ہل گئے

دل تو دل، رگ رگ کی باچھیں کھل اٹھیں
پھول سے چہرے جہاں بھی مل گئے

کون ہے ہم سا جہاں میں بامراد
ہم ملے تم کو، ہمیں تم مل گئے

پیار کی کشتی رہی منجدھار میں
کتنے ہی دھارے سوئے ساحل گئے

کھلکھلاہٹ اور اُس پہ سرکشی
بلبلے پانی میں پھر سے مل گئے

ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں
جب چھپے بیٹھے وہ دل میں مل گئے

ہم تو خود گم ہو گئے، منزل تو کیا
راہ چلتے جب حسیں کچھ مل گئے

کر تو بیٹھا عرضِ وصل اُن سے مگر
جن کا ڈر تھا وہ شگوفے کھل گئے

جب اُٹھی اُن کی نگاہِ کفر خیز!
پارساؤں کے بھی ایماں ہل گئے

پوچھنے آئے ہیں وہ تیرا مزاج
ہونٹ کیوں اب چارہ گر تیرے سل گئے

غزل

میں داغِ دل کو کسی طور دھو نہیں سکتا — کرم تمہارا بھلا دوں، یہ ہو نہیں سکتا

دیا ہے تم نے یہ سرمایہ عمر بھر کے لئے — تمہارا بخشا ہوا غم میں کھو نہیں سکتا

تمہارا حسن اشارے سے عشق کیسے سمجھے؟ — ہزار کہتے رہو تم، یہ ہو نہیں سکتا

میں آنسوؤں کے سمندر کو پی تو سکتا ہوں — تمہارا ریشمیں آنچل بھگو نہیں سکتا

کیا تھا وقف جسے آپ نے مری خاطر — وہ رات یاد جب آتی ہے سو نہیں سکتا

تمہاری یاد کو دل سے لگائے بیٹھا ہوں — تمہاری یاد بھلا دوں، یہ ہو نہیں سکتا

کسی کی مستی جوانی کا ہے اثر اے چرخ
کہ دل غموں میں ہنستا ہے، رو نہیں سکتا

بادۂ شیراز

غزل

خیر کن خیر، تو گناہ مکن — فردِ اعمال را سیاہ مکن

وقف کن بہر خدمتِ دنیا — نعمتِ زیست را تباہ مکن

انکساری نشانِ عظمت است — با تکبر بہ کس نگاہ مکن

من نکردم گہے شکایتِ تو — تو ہم اے دوست اشتباہ مکن

قلبِ من، مسکنِ جمالِ تست — مسکنِ حسن خود تباہ مکن

مستِ ناز است محوِ خواب درآ — شور اے مرغِ صبحگاہ مکن

نیست ہر کس شفیق و مخلص چرخ — بس بہ ہر کس تو رسم و راہ مکن

غزل

چشمِ ساقی میکدہ بہ دوش است — ہر کسے را اذنِ نادٔ نوش است

ہر کہ نوشد جامِ مستانہ شود — ایں کمالِ بادۂ سر جوش است

ایں نباشد رازِ تو افشا کند — مستِ حسنت بے نیازِ ہوش است

من بہ شوقِ سجدہ ام رفعت پذیر — آستانش آسماں ہمدوش است

من زہر پہلو بہ بندم ایں طلسم — خود فراموشی فریبِ ہوش است

آمدِ تو ولولہ انگیز بود — زندگی از رفتنت خاموش است

چرخ! بے خوابی بدارم در کنار
ہم عالم خواب در آغوش است

غزل

زلف بردوش اے نگارِ بیا — مثلِ محبوبہ تتار بیا

رونقِ بزمِ میکشاں سرد است — جامِ شعلہ فشاں بیارٔ بیا

شاعرم حسن را پرستارم — جلوہ افشاں بتِ نگارٔ بیا

گاہے گاہے تو ہم شراب بخور — گاہے گاہے تو کیف بار بیا

موج در موجِ سیلِ نور رواں — ماہتاب است جلوہ بار بیا

ہست اقلیمِ دل پراگندہ — بہرِ تنظیم، شہریار بیا

تار تار است جیب و دامنِ چرخ
بیں تماشائے ایں بہارٔ بیا

منظومات

بھگوان کرشن!

زیست کا ترجماں ہے میرا کرشن
یعنی جانِ جہاں ہے میرا کرشن!

ہے وہی مالک فنا و بقا
والیِ دو جہاں ہے میرا کرشن!

آپ جادہ ہے، آپ منزل ہے
یعنی منزل نشاں ہے میرا کرشن!

میری منزل قریب تر کر دی
رُوکش رہبراں ہے میرا کرشن!

باغِ ایماں کو تازگی بخشی
نازشِ گلستاں ہے میرا کرشن!

میری دُنیا سنوار دی اس نے
میری رُوحِ رواں ہے میرا کرشن!

فکرِ دُنیا و عاقبت ہی نہیں
ضامنِ دو جہاں ہے میرا کرشن!

بھگوان رام

زندگی اِترا رہی ہے آج تیرے نام پر
ناز ہے پیغمبروں کو بھی ترے پیغام پر
رہبرِ انسانیت! تیری عقیدت کے طفیل
ہم نے غلبہ پا لیا ہے گردشِ ایام پر
میرے دِل کی وُسعتیں انگڑائیاں لینے لگیں
جلوہ دیکھا جب ترا ہر موڑ پر، ہر گام پر
کیوں نہ ہو پھر عاقبت کی فکر سے وہ بے نیاز
زندگی قربان کر دی جس نے تیرے نام پر
موجزن ہے جس میں اے چرخ اک سرورِ سرمدی
میری دنیا ہے تصدق اُس چھلکتے جام پر

مہرشی سوامی دیانند

قوم کا جھنڈا فضاؤں میں اُڑاتا آیا
اسے تہذیب کا سرتاج بناتا آیا

جس سے ہر قوم کی تقدیر بنا کرتی ہے
ہمیں اخلاق کا وہ درس سکھاتا آیا

آتما صاف ہوا کرتی ہے جن جذبوں سے
مشعلِ رہ اُنہی جذبوں کو بناتا آیا

ہم دیانند کو کہتے ہیں پیمبر، لیکن
خود کو وہ قوم کا سیوک ہی بتاتا آیا

آریہ ورت کا روشن تریں مینار تھا وہ
روشنی سارے زمانے کو دکھاتا آیا

قوم کو شدھی کی تعلیم کا عنواں دیکر
قوم کو غیر کے پنجے سے چھڑاتا آیا

بھائی چارے سے، محبت سے، رواداری سے
قوم کو جینے کا انداز سکھاتا آیا

اپنی تہذیب جسے لوگ بھلا بیٹھے تھے
وید منتر سے وہی یاد دلاتا آیا

شاستر، وید کے منتر کا اُچارن کرکے
عہدِ ماضی کا اِک آئینہ دکھاتا آیا

گھور اندھکار تھا اگیان کا جاری ہر سُو
گیان اگیان کے انتر کو مٹاتا آیا

کفر و باطل کے اُڑے ہاتھوں کے طوطے اے چرخ
حق پرستی کا وہ یوں ڈنکا بجاتا آیا

مہاتما گاندھی

باپُو نے ہر انسان کو انساں سمجھا
ہندو کہ ہر فرد کو ایماں سمجھا
انجیل کو، قرآن کو اور گیتا کو
سینے سے لگایا انہیں یکساں سمجھا

تعمیرِ وطن سے تھی محبت اس کو
تخریب پرستی سے تھی نفرت اس کو
یہ دیش کا تھا ایکتا وادی لیڈر
مرغوب تھی تنظیمِ جماعت اس کو

سچائی کا اپدیش دیا باپو نے
پرچار اہنسا کا کیا باپو نے
قربانی و ایثار کے جذبہ کے طفیل
چھینا ہوا سوراج لیا باپو نے

نفرت سے بھری آگ بجھا دی اس نے
تحریکِ نوا کھلی دبا دی اس نے
وحشت زدہ ماحولِ سیہ میں آ کر
اک شمع اخوت کی جلا دی اس نے

مرا نہرو

سکون و امن و اماں کا وہ اک پیمبر تھا
مرے عظیم وطن کا عظیم لیڈر تھا

وہ انقلاب کا حامی تھا، انقلابی تھا
وہ شہسوار ازل ہی سے آفتابی تھا
شباب حسن تھا، حسن شباب تھا نہرو
جواں امنگوں کا رنگین خواب کا نہرو
اصول و عزم کا حامی تھا، پیکر ہمت تھا
وہ اپنے وقت کا اک صاحب شجاعت تھا
جبین ہند کو نہرو نے تابدار کیا
نگاہ دہر میں بھارت کو باوقار کیا

نہ پوچھ وسعت پرواز میرے نہرو کی
زمانہ سنتا تھا آواز میرے نہرو کی!

تمیز مذہب و ملت سے دور رہتا تھا
ہر اک بشر کی بھلائی میں چور رہتا تھا
وہ دل سے جذبۂ حب وطن کا شیدا تھا
تھا اس کے سر میں جنون دیش کی ترقی کا
صدائیں کہتی ہیں دن رات کارخانوں کی
رکھی زمین پہ بنیاد آسمانوں کی!
ہے برق ساز ہر اک ڈیم یادگار اس کی
یہ لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں بہار اس کی

عوام ہند کی تقدیر تھا مرا نہرو
وطن کے پیار کی تصویر تھا مرا نہرو

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان

خیر مقدم!

(۱)

پھول برساؤ اے وطن والو!
اپنی پلکیں بچھاؤ راہوں میں
حریت کا امام آیا ہے
بادشاہِ عوام آیا ہے

(۲)

خان بابا کی ذاتِ والا صفات
"محسنِ ہند" ہے حقیقت میں
کانگریس کو ملی تھی تقویت
اسی پختون کی رفاقت میں

(۳)

سارا ہندوستاں ہے گھر اس کا
میزباں یہ ہے، میہماں یہ ہے
اس کے بُوٹے ہیں یہ لگائے ہوئے
اس گلستاں کا باغباں یہ ہے

(۴)

اس نے آزادیِ وطن کے لیے
سو طرح کی صعوبتیں جھیلیں
جن سے خود موت بھی اماں مانگے
ایسی ایسی اذیتیں جھیلیں

ڈگمگائے کبھی نہ جس کے قدم
یہ وہ انساں ہے، یہ وہ انساں ہے
داد دو اس کے عزمِ راسخ کی
عزمِ راسخ ہی اصلِ ایماں ہے

جو تشدد کے معتقد تھے کبھی
وہ پٹھان اب اہنسا وادی ہیں
یہ کرشمہ ہے خان بابا کا
جادۂ آشتی کے ہادی ہیں

پانی بھرتی ہے زندگی اس کا
خان کی ذات پارسائی ہے
ہاتھ دھو لو تم اپنے وطن والو!
گنگا خود چل کے گھر میں آئی ہے

سامراجی فضا کے لوگ اے چرخ
آگ کا کھیل کھیلتے کیوں ہیں؟
سادہ دل، سادہ لوح بندوں کو
کشت و خوں میں دھکیلتے کیوں ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر حسین

ایک مردِ باصفا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین
نیک دل، فرماں روا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

سادہ دل، سادہ مزاج و باعمل انسان تھا
خوبیوں کا آئینہ تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

پاسدارِ حریت تھا، آبروئے ہند تھا
ایک سچا رہنما تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

اس کے ہاتھوں میں امانت تھی وطن کی زندگی
اک امین باوفا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

اس کے ہاتھوں میں سلامت تھا سفینہ دیش کا
یعنی اپنا ناخدا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

آسمانِ علم کا تھا اک درخشاں آفتاب
چشمۂ نور و ضیا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

مہربانی ہر سوالی پہ کیا کرتا تھا وہ
بے بسوں کا ہم نوا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

رہنمائے قوم ہو کر بھی گدائے قوم تھا
بے کسوں کا آسرا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

شرع کا پابند تھا لیکن تعصب سے بری
سچ تو یہ ہے دیوتا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

اک درخشندہ ستارہ تھا ہمارے دیش کا
کیا بتلائے چرخ؛ کیا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین

ترشح

آگ برساتی فضاؤں پہ دھواں سا چھا گیا
موسمِ باراں کی زد میں عہدِ گرما آگیا

ہلکے ہلکے ابر پارے رقص میں آنے لگے
برق کے سمٹے ہوئے آنچل کو سرکانے لگے

ہے صبا لپٹی ہوئی ہر وادیٔ گل رنگ سے
زندگی ہے زندگی نغماتِ خوش آہنگ سے

چند ہی چھینٹوں سے فطرت کا نقاب اُٹھنے لگا
غنچۂ خوابیدہ کا رنگیں حجاب اُٹھنے لگا

ٹہنیوں پہ لہلہانے کا جنوں چھانے لگا
آرزو افروز کہساروں کو جوبن آنے لگا

مسکراتی جھومتی گاتی گھٹائیں آگئیں
شوخیاں کرتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں آگئیں

کشت زاروں کو ترشح سے سرور آنے لگا
جوشِ رنگ و بُو میں دہقاں گیت برسانے لگا

یہ ہلکی ہلکی سی بوندیں گھٹا کے دامن سے
ہزار رنگ کے جلوے دکھا کے گرتی ہیں

فضا کے سینے میں اک گدگدی سی ہوتی ہے
خموش راہوں پہ جب جھنجھنا کے گرتی ہیں

نقاب اُٹھا دیا فطرت کا چند چھینٹوں نے
ہوا بہار کا احساس جلوہ زاروں کا

نظر فریب ہے ماحول کی درخشانی
ملا پیام ترانوں کا جوئباروں کا

بہاریں پھوٹ رہی ہیں فلک کے پردوں سے
گھٹا کی اوٹ میں بجلی نے جلوے دکھائے

نکھر نکھر کے سنبھلتے ہیں ابر پارے یوں
عروس پہلے پہل جس طرح سے شرمائے

کسان محو ہے کھیتوں کی آبیاری میں
رواں ہے نور کی ندی ہر اک کیاری میں

موسمِ گرما

بہارِ صبح پہ افسردگی سی چھائی ہے
چمن کے جلوؤں پہ اک بے حسی سی چھائی ہے

جھلس رہا ہے جہاں آتشیں بگولوں سے
اکھڑ رہی ہے فضاؤں کی سانس شعلوں سے

تڑپ رہی ہیں حرارت سے دہر کی نبضیں
رواں دواں ہیں بصد جوش آگ کی لپٹیں

ہوائے گرم کا گہوارہ بن گئی دنیا
سراپا سوز کا نظارہ بن گئی دنیا

بساطِ خاک پہ پھر جھکڑوں کا دور آیا
برنگِ موجۂ طوفاں، پیامِ جور آیا

نشانہ بن کے رہی تشنگی کا فطرت بھی
بساطِ دہر پہ طاری ہے جون کی گرمی

کہاں سے آئے سیہ مست بادلوں کی نوید
عروج پہ ہے بہارِ تمازتِ خورشید

سحر خیزیِ سرما کا دور ختم ہوا
بہارِ انجمن اک سانس میں ہوئی برہم

نہیں ہے برگِ گل و لالہ پہ کوئی موتی
دلِ چمن میں ہوا جذب گریۂ شبنم

تھپیڑے لو کے چلے شعلہ رو ہوئی دنیا
شرر فشانیِ خورشید کی بہار آئی

چراغِ بزمِ زمستاں بجھا بجھا سا ہے
فضا نے لی ہے جھلستی ہوئی سی انگڑائی

فلک کے تاروں میں لرزش سی ہو گئی پیدا
زمیں کے ذروں کی تابش نے وہ سماں باندھا

ہوائے گرم کے جھکڑ کچھ اس ادا سے چلے
حیات و مرگ کو مانندِ کہکشاں باندھا

کڑکتی دھوپ میں ہنستا ہے سایہ پیپل کا
کہ دھوپ چھاؤں کی زد میں ہے محفلِ قدرت

رہینِ شکوۂ گرما ہوں کس لئے دیہات
ادا شناسِ فلک ہے کسان کی فطرت

آمدِ بہار

پھول برساتی ہوئی مست فضائیں جاگیں　　فصلِ گل آنے پہ فطرت کی ادائیں جاگیں

ذرّے ذرّے کو تبسّم کا پیام آتا ہے　　مسکراتے ہوئے غنچوں کا سلام آتا ہے

پتّی پتّی پہ نئے رنگ کا جوبن آیا　　شاخیں لہرائیں کہ بہکا ہوا ساون آیا

باچھیں پھولوں کی کھلیں، شاخوں پہ کلیاں پھوٹیں　　عہدِ سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی نبضیں چھوٹیں

ساقیِ رُت نے بہ شکن موجِ بہاراں لایا　　پھوٹتی ہلتی اُمنگوں کو خراماں لایا

نکھرا نکھرا سا ہے ہر نقش پری خانوں کا　　رُوپ خنداں نظر آنے لگا افسانوں کا

نرگس و لالہ کو تاکیدِ خود آرائی ہے
لے کے رحمت کی گھٹا فصلِ بہار آئی ہے

سرودِ صبح

عروسِ صبح فضاؤں کو جھنجھناتی ہے　　فلک کے مست ستاروں کو نیند آتی ہے

پتنگے شمع پہ شب بھر اُڑتے رہتے ہیں　　سحر کے ساز پہ ہر شمع تھرتھراتی ہے

تھرتھر کے دمکتے ہیں اوس کے موتی　　جبینِ غنچۂ نوخیز مسکراتی ہے

ضیا لرزتی ہے نغموں کی خوابگاہوں میں　　خموش کھیتوں میں بجلی سی کوند جاتی ہے

چمن میں چلتی ہے مستانہ جب نسیمِ سحر　　فضائے نور ستاروں کو گدگداتی ہے

سحر سناتی ہے جب اپنا نغمۂ رنگیں　　رگِ حیات میں بجلی سی دوڑ جاتی ہے

گاؤں کی دُنیا!

لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے نظارے دیکھے
مسکراتے ہوئے پھولوں کے اشارے دیکھے
جابجا نہر کے پانی کا ترنّم دیکھا
کیف میں ڈوبا ہُوا ذوقِ تکلّم دیکھا
خاک کے ذرّوں کو ہم دوشِ ثریّا دیکھا
راہ پر بُلبل کو ہم آغوشِ ثریّا دیکھا
بڑ کے سایے تلے چوپال کا منظر دیکھا
ظُلم کو ٹلتے ہوئے دار و رسن پر دیکھا
دُودھ کا دُودھ یہاں پانی کا پانی دیکھا
یعنی ہر پنچ کو انصاف کا بانی دیکھا
رات بھر ہنستی ہوئی نور کی ٹولی دیکھی
چاند تاروں کی بہم آنکھ مچولی دیکھی
صُبح کے وقت بغاوت کا فسانہ دیکھا
رنگ آزادی کا پُرکیف ترانہ دیکھا
دستِ خورشید سے بجتے ہوئے تارے دیکھے
خودکشی کرتے ہوئے نُور کے پارے دیکھے
گاؤں کیا دیکھا، نئی قسم کی دُنیا دیکھی
ذرّے ذرّے میں نہاں وُسعتِ صحرا دیکھی

دہقان کی دنیا

دہقان ہے فصلوں کے نظاروں کا پرستار
ہنستے ہوئے خوشوں کے اشاروں کا پرستار
مٹّی کے گھروندوں میں نہاں اس کے فسانے
تہذیب نو رکھتے ہیں جواں اس کے ترانے
باقی ہے اُخوّت کی کہانی بھی اِسی سے:
مہمان نوازی کی نشانی بھی اِسی سے
ہے جان دو عالم کی یہ خاموش سا انساں
سادہ دِل و سرمست و فاکش سا انساں
دِن رات یہ کہتا ہے ادا شکر خدا کا
پیکر ہے غرض صبر و تشکّر کا، صفا کا
دہقان کی دُنیا ہے نمائش سے کہیں دُور
تحسین خود آرا و ستائش سے کہیں دُور
راحت اسے خنکی کی ہے گرما میں میسّر
تسکین تمازت اسے سرما میں میسّر
دُنیا کی مُسرّت میں خوشی اِس کی نہاں ہے
صد جوہرِ مسلسل میں ہنسی اِس کی نہاں ہے
تدریسِ عمل دیتی ہے دہقان کی دُنیا
فطرت سے صلہ پاتی ہے انسان کی دُنیا

دہقان

جھلملایا صبح کا تارا، سحر ہونے لگی
اک تجلّی سی فضا میں جلوہ گر ہونے لگی

گاؤں میں بادِ صبا اٹھکیلیاں کرنے لگی
ذرّے ذرّے کو نئے سر سے جواں کرنے لگی

جاگ اُٹھا دہقاں، دھر انگڑائیاں لیتا ہوا
بیل کھولے، ہل اُٹھایا اور کھیتوں کو چلا

تن بدن موٹے سے کھدر کی ردا سے ڈھانپ کر
خون پسینہ ایک کرنے کو چلا، وقتِ سحر

ماہیا گاتا ہوا، ڈھولے سے گرماتا ہوا
کھوئی کھوئی سی فضا پر کیف برساتا ہوا

زادۂ دہقاں کہ ہے بیگانۂ خوئے سکوں
خون بن کر دوڑتا ہے اس کی نبضوں میں جنوں

فطرتِ دہقاں مسلسل سعی پر مجبور ہے
اس کی رگ رگ میں تڑپنے کی ادا مستور ہے

فکرِ سرما بھی نہیں، احساسِ گرما بھی نہیں
حکمِ فطرت پر ازل ہی سے ہے خم اس کی جبیں

اس کی محنت کا پھل ہی عام سب کے واسطے
اور خدمت ہے اس کا کام سب کے واسطے

مستِ صہبائے عمل، خاموش سا انسان ہے
ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا تسکینِ دہقان ہے

پنہاریاں

سحر تازہ کا خورشید نے پیغام دیا
رات کے جاگے ہوئے تاروں نے آرام کیا

صبح انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوئی
مست و مخمور فضاؤں میں ضیا بار ہوئی

شاخ پیچیدہ پہ بل کھانے لگی زلفِ نسیم
کیف زا جھولوں پہ لہرانے لگی بادِ شمیم

مسکراتا ہوا اندر کا اکھاڑا جاگا
آنکھیں ملتا ہوا ماحول دلارا جاگا

لے کے گاگر چلیں پنہاریاں پانی بھرنے
خواب آلود فضاؤں کو شرابی کرنے

نظر آتی تھی جوانی ہی جوانی ہر سو
گدگداتی تھی نگاہوں کی روانی ہر سو

ایک اک گام پہ بچھتی تھی نگاہیں اپنی
نغمۂ عیش ہوئی جاتی تھیں آہیں اپنی

اور ہی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا گلشن ان کا
دل لگی کرتا تھا ابھرا ہوا جوبن ان کا

سر سے دوپٹہ سرکتا تھا بڑے ناز کے ساتھ
پائلیں پاؤں میں بجتی تھیں اک انداز کے ساتھ

ذرے ذرے سے محبت کا پیام آنے لگا
تشنگی جس کو ترستی تھی وہ جام آنے لگا

جھٹپٹا!

شفق میں سہما ہوا سا ہے نور کا عالم
غموں میں کھویا ہوا ہے شعور کا عالم

زوال پہ ہے بہارِ تجلیٔ خورشید
جگر خراش ہے فرقت کی شام کی تمہید

ہوا نے چھیڑ دیا سسکیوں کا اک تارا
چلا ہو روٹھ کے محفل کی آنکھ کا تارا

خموش راہوں میں باقی نہیں ہے کیف کوئی
یہ کیا گھڑی ہے کہ مونس نہیں ہے حیف کوئی

کہانی غم کی گھنی جھاڑیوں نے دہرا دی
خموش راہوں پہ اک مردنی سی پھیلا دی

غنودگی سی بساطِ جہاں پہ چھائی ہے
رگِ حیات میں آشفتگی سی آئی ہے

نہ کہیں کسان کے ہونٹوں پہ نرم رو آہیں
سکوں پذیر ہیں برق آشنا چراگاہیں

تمام دن کے تھکے ہارے سٹک کے چلے
سکونِ خاطرِ ناشاد خود لٹ کے چلے

فضا خموش ہے، اشجار سنسناتے ہیں
فسردہ لے میں غمِ دل کو گدگداتے ہیں

چودھویں کا چاند

ہنستا ہُوا انگڑائیاں لیتا ہُوا مہتاب
تاروں کو حسیں لوریاں دیتا ہُوا مہتاب
ماحول کو خوش رنگ بناتا ہُوا نکلا
افسردہ فضاؤں کو ہنساتا ہُوا نکلا
بادل شبِ ظلمات کے چھٹنے لگے ہر سُو
انبارِ زر و سیم کے بٹنے لگے ہر سُو
دُنیا کو نظر آیا قمر طُور کی مانند
بدلی کے دریچے سے حسیں حُور کی مانند
چھنتی ہے بصد ناز ضیا ارض و سما سے
نکھری ہے کرن اور بھی شاداب فضا سے
کرتی ہے جبیں سائی حسینوں کی جوانی
سرگشتہ نظر آتی ہے کوثر کی روانی
ہے صُورتِ بستانِ ارم، نجد کا عالم
دیوار و در و دشت پہ ہے وجد کا عالم
خوشوں کو ضیا دینے بجانے لگیں کرنیں
دہقان کی دنیا کو ہنسانے لگیں کرنیں
ہر ذرۂ ناچیز ہے مہتاب کی بستی
غیرتِ دہ صد طُور ہے ہر منظرِ ہستی

ولولے!

اگر حباب نہ اُبھرے تو آب کی توہین
جو خون جوش نہ کھائے شباب کی توہین

جس انقلاب سے زیر و زبر نہ ہو ماحول
وہ انقلاب ہے خود انقلاب کی توہین

مزاجِ دہر ازل سے سکوں پسند نہیں
یہی سبب ہے کہ ہوتے ہیں زلزلے پیدا

ہوا کی موج کا ذرّے بھی ساتھ دیتے ہیں
کہ اُن کے دل میں بھی ہوتے ہیں ولولے پیدا

اگر ادائیں ہیں حسنِ جواں کا گہوارا
حیا کی شوخی بھی اک کشمکش کی صورت ہے

وہ عشق عشق نہیں جس میں ہے نہ جولانی
دل و دماغ کو عشقِ تپاں کی حاجت ہے

جو آنسوؤں کو نہ چمکائے وہ خوشی کیا ہے؟
نہ آئے موت پہ غالب تو زندگی کیا ہے؟

عزمِ سپاہی

میں جا رہا ہوں جنگ کے شعلوں سے کھیلنے
آتش فروز اُٹھتے بگولوں سے کھیلنے
برق آشنا دمکتے شراروں سے کھیلنے
تقدیر کے چمکتے ستاروں سے کھیلنے
گیسوں، بموں سے، تیر تفنگوں سے کھیلنے
"بہ چشم بدوش" دل کی اُمنگوں سے کھیلنے
اِک اِک قدم پہ خُونیں جفاؤں سے کھیلنے
دُشمن کی بے پناہ بلاؤں سے کھیلنے
خُونریز انقلاب کے چھینٹوں سے کھیلنے
خود اپنے اضطراب کے چھینٹوں سے کھیلنے
تیغوں کی شعلہ ریز روانی سے کھیلنے!
فتنہ اٹھانے والی کہانی سے کھیلنے
ٹینکوں سے، بلٹنوں سے پیادوں سے کھیلنے
سائنس کی وحشتوں کے ارادوں سے کھیلنے
میں دشمنوں کے چھکے چھڑا کے ہی آؤں گا
اپنے وطن کی آن بچا کے ہی آؤں گا

اَے فساد پسند!

حسد کے سینے میں اک آگ سی ہے شعلہ فگن
سمجھ تو امن کے نغمے کو کون سنتا ہے

شرارۂ برق کا حامل ہے آشیاں اپنا
بخاک و خوں ہوا غلطاں امیرِ نثار اپنا

ہے سانس سانس سے پیدا ہراس کا عالم
دکھائے جاتے ہیں ہر سو فساد کے انداز

قدم قدم پہ فروزاں ہے آگ نفرت کی
یہ انتہا ہے خیالات بربریت کی

نئی روش ہے وطن کی، نئی اُمنگیں ہیں
ہوا تمیز کا عنصر شعور سے کافور

لہو میں ڈوبے ہوئے پیرہن نظر آئے
حواس باختہ اہلِ وطن نظر آئے

اگر ہے امن کا دُشمن فلک، تو کیا غم ہے
کچل نہ روحِ محبت کو اَے فساد پسند!

حریفِ پیرِ خرابات ہے نظامِ نو
اُڑا رہا ہے مذاق اپنا اہتمامِ نو

عناد و بغض و کدورت کی حد بھی ہوتی ہے
تری سرشت پہ فطرت کی آنکھ روتی ہے

دو قطعات

خون دیتے ہیں جب وطن کے جوان
زندگی دیش کی سنورتی ہے
جو وطن پر نثار ہوتے ہیں
موت بھی اُن پہ ناز کرتی ہے

جب برستے ہیں پے بہ پے شعلے
مسکراتی ہے لَو جوانی کی :
جب جوانوں کا خون اُبلتا ہے
آس بڑھتی ہے کامرانی کی

سابقہ تصنیف "حسنِ نظر" سے متعلق دورِ حاضر کے نقادانِ ادب کی آراء

بابائے اردو علامہ ڈاکٹر منوہر سہائے صاحب انور

ایم۔ اے، ایم او۔ ایل، پی ایچ ڈی۔

بے لاگ رائے

۴ ستمبر ۱۹۶۷ء

عزیزم، زندہ باد!

"حسنِ نظر" ملا۔ شکریہ

آپ خوب لکھتے ہیں۔ آفریں۔ کیا قطعات اور کیا غزلیات سب نہایت عمدہ ہیں۔ آپ کے کلام میں جدت ہے جو آجکل پرانے اور نئے شاعروں کی تصانیف میں بہت کم نظر آتی ہے۔

مجھے "حسنِ نظر" پڑھ کر دلی مسرت حاصل ہوئی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اردو کو آپ سے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔

دعاگو

منوہر سہائے انور

ابو الفصاحت علامہ جوشؔ ملسیانی جانشین فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی

"اظہارِ رائے"

چرخؔ صاحب چنیوٹی کا کلام "حسنِ نظر" جو بہت سے قطعات اور متعدد غزلیات پر مشتمل ہے، مَیں نے ضعفِ بصارت کی وجہ سے سرسری طور پر دیکھا۔ کلام پاکیزہ اور پسندیدہ ہے، قطعات بھی افادی حیثیت کے ہیں، مضامین میں گہرائی بھی ہے۔ اس وصف کی وجہ سے معنویت کی شان بھی اس میں پائی جاتی ہے۔

خدا کرے کہ یہ حسنِ قبول کا شرف حاصل کرے۔

جوشؔ ملسیانی
۱۹ ستمبر ۱۹۶۷ء نکودر

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ریٹائرڈ صدر شعبۂ اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"رائے"

مکرمی، تسلیم

گرامی نامہ صادر ہوا اور آپ کے کلام کا مجموعہ "حسنِ نظر" بھی۔

آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے ان دنوں لکھنے پڑھنے کا شغل تقریباً بند ہے۔

کلام جہاں تہاں سے دیکھا گیا۔ تازگی اور جودت ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۲۰ ستمبر ۱۹۶۷ء

ذکا اللہ روڈ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

سلطان الغزل علامہ شیام موہن لال جگر بریلوی

"رائے"

۲ نومبر ۱۹۶۷ء

پیرانہ سالی، ضعف دماغ و ضعف بصارت کے باعث خود "حسن نظر" پڑھ کر نہ دیکھ سکا۔ پڑھوا کر سُنا۔ دل بہت خوش ہوا۔ جاوید وششٹ صاحب نے جو تبصرہ اس پر لکھا ہے اُس سے مجھے حرف بحرف اتفاق ہے۔ "حسن نظر" میں بھرپور شباب کی ترنگیں موجود ہیں بڑی رُومانیت اور رعنائیت کے ساتھ۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ رُومانیت انتہا درجے کی ہو کر بھی پستی کی طرف مائل نہ ہوئی اور تہذیب کے دامن پر دھبہ نہ بنی۔ یہ بات آسان نہیں، اس لئے ہر شخص کو نصیب نہیں۔ سعدی کہتے ہیں ؎ درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

میں ایسی ہی شاعری کا پرستار ہوں۔ رُباعی ؎

فن میں عریانیت کا قائل ہی نہیں تہذیب کی رفعتوں میں ہے میرا یقین

جس فن سے ہو آراستہ تصویرِ حیات وہ فن ہے بشر میں جیسے خاتم میں نگیں

"حسنِ نظر" میں ایک اور خاص بات نمایاں ہے۔ اُردو میں دو زبانیں ہیں۔ ایک کتابی اور ایک گھریلو۔ دونوں میں ایک خلیج حائل ہے۔ جوہر صاحب نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ گھریلو الفاظ سے مغائرت نہیں برتی ہے۔ "حسنِ نظر" میں اس کا کافی ثبوت ملتا ہے مثلاً دوپٹہ، بیا، کنگن، انگ انگ وغیرہ۔ الفاظ کہیں کہیں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

یہ ہماری تمنا ہے جوہر صاحب کو بڑی عمر دے۔ تندرستی دے اور فارغ البالی کہ وہ اُردو کے خزانے کو اپنے جواہرات سے ہمیشہ مالا مال کرتے رہیں۔

نیاز کیش

جگر بریلوی

علامہ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی خلف الرشید ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی

"حسنِ نظر" میری نظر میں

جناب چرخ چنیوٹی کے مجموعۂ کلام "حسنِ نظر" میں بڑی کشش ہے۔ میں نے ایک ہی نشست میں اُن کے قطعات اور غزلوں کا سیر حاصل مطالعہ کر لیا۔ ان کا کلام جاذب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شگفتگی اور بے ساختگی بہت ہے۔ رومانی انداز میں ان کے قطعات لاکھ تقلیدی ہوں، وہ خود اُن کے جمالیاتی ذوق کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ یوں تو ہر قطعہ میں یک گونہ ایک ندرت پائی جاتی ہے۔ لیکن حسبِ ذیل قطعات سے میں بہت محظوظ ہوا ؎

چمن میں آ کے بہاروں کا کوئی گیت چلے — کلی کلی سے تبسم کی بات چیت چلے
تو ہی بتا کہ فضائیں اُداس ہیں کہ نہ ہوں — ترے فراق میں کتنے زمانے بیت چلے

تنگ قافیے کے ساتھ "چلے" کی ردیف محاورے کا مزہ دے رہی ہے۔

؎ نگاہیں اُٹھتے اُٹھتے جھک گئی ہیں — تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا ہے
حیا کا پاس رکھ کر چرخ کوئی — کہانی اپنے دل کی کہہ گیا ہے

محبوب کی ترجمانی کا کیا خوب انداز پیدا کیا ہے

؎ غم بھرے آنسوؤں کو پی لوں گا — میں تو اپنی زباں بھی سی لوں گا!
دیکھ لو تم بھی توڑ کر رشتہ! — مجھ میں ہمت ہوئی تو جی لوں گا

اگر میں تیسرا مصرعہ کہتا تو یوں کہتا: "دیکھ لیں آپ توڑ کر رشتہ" چوتھے مصرعے کے تیور بڑے پیارے ہیں۔ ؎

دن کو کرتے ہیں رات کا وعدہ — شب کو دن کا فریب دیتے ہیں

ان کے وعدوں کا کچھ یقیں تو نہیں — آج کا دن بھی دیکھ لیتے ہیں

چونکہ مصرعہ کی معنویت اپنی بولتی ہوئی تصویر ہے۔

دورِ موجودہ کے غیر رومانی ماحول پر اس قطعہ میں بڑی اچھی طنز ہے۔

یہ کون سلطنتِ دل کی شاہزادی ہے — یہ کس زمانے سے جس نے مجھے صدا دی ہے

خبر نہیں اسے شاید کہ دورِ عشق گیا — جو آج کل کا زمانہ ہے اقتصادی ہے

حسب ذیل قطعہ میں امید و یاس کو پتلیوں کا تماشا کہہ کر چرخ صاحب نے تشبیہ میں ایک ندرت پیدا کی ہے۔

کبھی آنکھوں میں ہے خوشی کی برات — کبھی کاندھوں پہ غم کا لاشہ ہے

جس کو امید و یاس کہتے ہیں — پتلیوں کا وہ اک تماشہ ہے

اس قطعہ کی فصاحت قابلِ داد ہے، اس کی رندانہ کیفیت بھی ایک موجِ شراب نظر آتی ہے۔ پارسائی کو مری آج شرابی کر دے۔ اپنے ہونٹوں سے مرے ہونٹ گلابی کر دے تو شبِ وصل کی یادوں کے کھلا کر غنچے۔ دن کے ماحول کو تھوڑا سا عنابی کر دے

یہ قطعہ کتنا نرم و نازک ہے۔

اس کا سارا بدن ہے شرمیلا — ان چھوا کوئی پھول ہو جیسے

اک ذرا سا بھی ہاتھ لگنے سے — لاجونتی ملول ہو جیسے

غرضیکہ ایسے ہی پُر کیف رومانی قطعات کی کافی تعداد ہے۔ کچھ قطعات زیرِ عنوان "وحدت سے متعلق" بھی چرخ صاحب کے روحانی کہیے یا مذہبی رجحانات کی غمازی کرتے ہیں۔ ان قطعات میں بھی ان کا شگفتہ طرزِ بیان پایا جاتا ہے اور دلی خلوص کی جھلک ملتی ہے۔ انسان گمراہی اور ضلالت

کا شکار ہو کہ بعض مرتبہ جلد، اور اکثر بدیر راہِ راست پہ آجاتا ہے۔ خدا کے ہر نقش کو صفحۂ دِل سے فراموش کر دینے والا انسان بھی ایک نہ ایک روز آ کر پھر اُس کی پناہ لینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ اِسی لیے چرخ صاحب نے بھی خوب کہا ہے ؎

کوئی کتنا ہی رہے دور خدایا تجھ سے — پھر پھرا کر ترے سایے ہی میں دم لیتا ہے

چرخ صاحب گیتا کے معتقد ہیں۔ صحیح معنوں میں ہندو ہونے کے باعث انہیں گیتا بھگت ہونا ہی چاہیے۔ اگرچہ گیتا کا پیغام فی الاصل ساری دنیا کے نام ہے، کسی خاص فرقے اور ملک و ملت کے لیے مخصوص نہیں۔

چرخ، رام نام کی عظمت سے بھی واقف ہیں۔ تُلسی داس جی نے اپنی رامائن میں رام نام کو رام کی ذاتِ مقدس پہ بھی ترجیح دی ہے۔ میں نے بھی کہا ہے

؎ ہے مددگار ہمارا کتنا — اِس سے ملتا ہے سہارا کتنا!
تین حرفوں میں ہے سب کچھ موجود — رام کا نام ہے پیارا کتنا!

چرخ صاحب نے بھی اپنے اِس قطعہ میں جس انداز سے رام نام کی عظمت بیان کی ہے، اُس سے دل فدائے جلوۂ نور ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

بس گیا رام جس کی نس نس میں — جگمگانے لگی حیات اس کی!
مِل گیا اُس کو اک پیام سکوں — چھا گئی دو جہاں پہ ذات اُس کی

کون رام بھگت ہے جو چرخ صاحب کے اِس قطعہ کو اپنے محبوب و معبود کے شایانِ شان نہ قرار دے گا۔

قطعاتِ آزادی میں مجھے چرخ صاحب کا یہ قطعہ اُن کی روشن دماغی

کا نمونہ نظر آجاتا ہے ؎

دے کے پیغام امن دنیا کو | وسعتِ زندگی پہ چھا کے چلیں
آتمک شکتیوں کا لے کے چراغ | ہر اندھیرے کو جگمگا کے چلیں

"آتمک شکتیوں کا چراغ لیے کر چلنا" یہ ایک رُوحانیت پسند شاعر ہی کہہ سکتا ہے
اِس قطعہ میں "پیار کی سرسوتی" نے جو کیفیت پیدا کی ہے اُسے کچھ اہلِ دل ہی محسوس
کر سکتے ہیں ؎ آ در مِل جائیں مثلِ گنگ و جمن ۔ پیار کی سرسوتی اُبھر آئے
چھوڑ دیں راستے جدائی کے ۔ دو دِلوں کی مُراد بر آئے

پریمؔ کی غزلوں میں بھی ہمیشہ اُن کی رُوحانی ذہنیت جھلکتی ہے ۔ بعض اشعار کی
بندشیں بڑی حسین ہیں ۔ مثلاً ؎ چھلک چھلک کے بھی جوبن ترا چھلک نہ سکا
بکھر بکھر کے بھی جلوے ترے بکھر نہ سکے

اسی غزل کا یہ شعر حقیقت کی ایک صحیح تصویر ہے ؎

خلوص و شوق سے سمجھا ہے دوستی کا محل | خلوص و شوق کی ہم لوگ قدر کر نہ سکے

مجھے کچھ اشعار اپنی نا قابلِ اظہار گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بہت پسند آئے ؎

ستارے خود کو سجاتے رہے دُلہن کی طرح | مگر کسی بھی سہاگن کا رُوپ بھر نہ سکے
تصویر غم کی اور کروں پیش کس طرح | آنسو بھی بہہ رہے ہیں کہانی کے ساتھ ساتھ
منزل ہماری راہ میں پیری کی آ گئی | دو ہی قدم چلے تھے جوانی کے ساتھ ساتھ
ہو تری زلف کا سایہ کہ مری آہ رسا | تیرے کوچے میں اک اک رات رہا ساتھی ہیں دونوں
میری آنکھوں سے اشارے تری خاموش رضا | گونج ہی گونج ہیں آواز کہاں ہیں دونوں
داستاں دل کی کہہ تو دوں لیکن | آپ کی بات بات کھلتی ہے ؛

غم کے ہاتھوں حیات بنتی ہے
عشق کی کائنات بنتی ہے

دل اُجڑتا ہے تیرے ہجر سے
تیری زلفوں سے رات بنتی ہے

تمہارا خیال کہیں کروٹیں نہ لیتا ہو
یہ کیوں خلش سی جگر کے قریب ہوتی ہے

اُس بُت کی جواں عمرِ محبت کا کرم ہے
ہم لوگ کہن سال تھے ہیں پھر بھی جواں ہیں

کبھی کبھی نظر آتے ہیں خُلد کے جلوے
کبھی کبھی تیری قربت نصیب ہوتی ہے

احساس بھی کچھ ہے تجھے رفتارِ زمانہ
صدیوں سے کہاں بیٹھے تھے، برسوں سے کہاں ہیں

محروم دید کر کے نکالو نہ شہر سے :
اچھا نہیں مذاق غریب الوطن کے ساتھ

وہ جانِ نو بہار چمن میں جب آ گیا
خنداں ہوا چمن کا چمن بانکپن کے ساتھ

زندگی حاصلِ گناہ تو ہے
زندگی حاصلِ گناہ نہیں

خواب میں آؤ، بے جھجک آؤ !
خواب میں کوئی سدِّ راہ نہیں

پیار کرتا ہوں پیار کی خاطر
پیار کرنا کوئی گناہ نہیں

نقشے نئے، فسانے نئے، زاویے نئے
آئینہ خیال ہے یہ کائنات بھی !

دل کو لے لو تم اپنے دامن میں
پھول کھلنے دو یہ گلشن میں

ان کی انگڑائیوں کے حسین زاویے !
عرضِ مطلب کے خاکے بدلتے رہے

اس عہدِ جوانی میں یادوں کی کہانی میں
کچھ نقش ہمارے ہیں کچھ نقش تمہارے ہیں

وہ شوخ و شنگ نگاہی کہاں گیا؟
وہ تیر کیا ہوا، وہ نشانے کدھر گئے؟

دنیا بھی گھومتی ہے اشاروں کے ساتھ ساتھ ۔ پلکوں کے زاویوں کی ادائیں نہ پوچھیے

اور حزیں صاحب کے اس تجربہ میں شامل ہونے کا داعی میں بھی ہو سکتا ہوں ۔

میں نے بھی جہاں سے بھی بڑھ کے جسے پیار کیا
وہ مرے نام سے بیزار نظر آتا ہے

دل پھڑکتا ہے ترے حسن پہ قرباں ہو کہ
اور ہوتی ہے مری جان محبت کیسی!

اگر شباب میں سرمستی۔ شباب نہیں
تو حسن اپنی اداؤں میں کامیاب نہیں

آنا جانا کیا ہوا بس اک قیامت ہو گئی
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے، کرنے لگے جانے کی بات

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو قطعات یا جو غزلیہ اشعار میں نے اوپر نقل کئے ہیں۔ ان کے علاوہ چرخ صاحب کا کلام کسی طرح کم اہم ہے۔ البتہ بعض بعض مقامات پر مجھے کچھ ایسی بندشیں ایسی ضرور نظر آئیں جو ترقی طلب معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے مقامات بہت کم ہیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

لیکن چرخ صاحب کے بیشتر اشعار اتنے صاف اور پُر معنی ہیں کہ انہیں ضرب المثل ہونے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے۔

بشیشور پرشاد منور

دہلی۔ ۲۷ اگست ۱۹۶۷ء
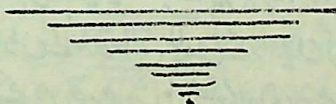
ڈاکٹر گیان چند جین ایم اے، پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی

"حسنِ نظر" پر رائے

چرخ چنیوٹی صاحب کا مجموعۂ کلام "حسنِ نظر" نظر افروز ہوا۔ ان کی تصویر دیکھی، ایسا لگا کہ اس چہرے مہرے کے انسان کو کہیں دیکھا ہے۔ کب اور کہاں؟ یاد نہیں۔ اس احساسِ مانوسیت کے ساتھ تعارفی مضامین پڑھے تو اور بھی خوش ہوا کہ یہ حضرت اردو شعراء کی روائت کے برعکس خوش باش اور قہقہہ دہن ہیں۔ ایسے شخص کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا موقع میسر آ جائے تو زندگی بسر کرنے میں کسی قدر جی لگنے لگے۔

"حسنِ نظر" قطعات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ اڈیلین سریش نے اپنے لئے قطعات چن لئے۔ بڑی شگفتگی ہے ہر قطعے کے مصرعۂ دوم میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی بات یا خیال ہے۔ بالعموم انکا دلچسپ انداز گفتار ہے۔ ہمارا انہیں پڑھ کر دل بہلتا ہے اور چرخ کی باغ و بہار اور چنچل شخصیت سے ملنے کا اشتیاق اور بڑھ جاتا ہے۔

گیان چند

۶ نومبر ۱۹۶۷ء

جناب لکشمی نرائن صاحب لیکچرر شعبۂ انگریزی جموں اینڈ کشمیر یونیورسٹی جموں

"تبصرہ"

جناب چرخ چنیوٹی کی کتاب حسنِ نظر سالِ رواں میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اُن کا کلام قطعات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ آپ کے کلام میں احساس کی گہرائی اور خیالات کی بلندی ہے۔ روایتی پن کم اور انفرادیت زیادہ ہے۔ یہ لطیف بھی ہے اور پُرجوش بھی خیالات اور اندازِ بیان دونوں ہی میں نیاپن ہے۔ جراتِ خیال و جراتِ گفتار ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔ اس لئے فنّی لحاظ سے ان کے کلام میں ایک توازن پیدا ہو گیا ہے۔ سارے کلام میں ایک بھی بدسلیقہ استعارہ اور تشبیہ نظر نہیں آتی۔ چرخ صاحب کا تخیّل زرخیز ہے اس لئے وہ نئی تشبیہات ڈھونڈ نکالنے میں ماہر ہیں۔ مثلاً ؎

جب وہ آئے تو گھٹے آنسو - میری پلکوں پہ یوں مچل مچل کے چلے

جیسے بچے نکل کے مکتب سے - گھر کی جانب اچھل اچھل کے چلے

آنکھوں سے آنسوؤں کی روانی اور مکتب سے بچوں کا پُرمسرت انداز میں گھر کی جانب لوٹنا، دو مختلف چیزوں کو شاعر نے اپنے تخیّل سے ایک ہی سطح پر لا کر عجیب اثر پیدا کر دیا ہے۔ یہ قطعہ انگریزی شاعری کے METAPHYSICAL انداز سے میل کھاتا ہے۔ تشبیہ کی نزاکت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ بچوں کی مسرت سے آنسوؤں کا مقابلہ کر کے شاعر نے اشارتاً یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ آنسو بھی اب یادہ نہ یہ شاعر کی آنکھوں کی اسیری برداشت نہیں کر سکتے اور پھوٹ پڑنے کے لئے بیتاب ہیں۔ تنہائی کے احساس کو شاید ہی کسی شاعر نے اس سے بہتر طریقے سے ادا کیا ہو۔ اس سے چرخ صاحب کے کلام کے دوسرے پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ المیہ بات بھی نشاطیہ انداز سے کہہ دیتے ہیں۔ حسن کاری میں چرخ صاحب اپنی مثال آپ ہیں ؎

کگن کگن تیری زلفوں کی بات چلتی ہے
سحر سحر کے اُجالے میں رات چلتی ہے
ترے حسین تصوّر کا آسرا لے کر
ہزار رنگ میں یہ کائنات چلتی ہے

یہ قطعہ حسنِ حقیقی اور حسنِ مجازی کا خوبصورت اور تقابل ادمرقع ہے۔ زلف اور کگن کو ایک دوسرے سے متعلق کر کے تشبیہ استعارے میں جو ظرافت پیدا کی گئی ہے وہ چرخ صاحب کا حصّہ ہے۔ ادائے حسن کے ساتھ ساتھ وہ غمِ دنیا سے بھی باخبر ہیں۔ اس لئے عشق کے تقاضوں کے ساتھ وہ زندگی کے تقاضوں کو ایک جا کر اُن میں ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں ۔

یہ کون سلطنتِ دل کی شاہزادی ہے
حریمِ ناز سے جس نے مجھے صدا دی ہے
خبر نہیں اُسے شاید کہ دورِ عشق گیا
جو آجکل کا زمانہ ہے اقتصادی ہے

یہی وجہ ہے کہ اُن کا ذوقِ جمالیات غمِ روزگار سے ٹکرا تا ہے۔ اُن کی مستی خود فریبی نہیں ہے بلکہ خود آشنائی ہے۔ ان کی غزلیات میں بیان کی روانی، لہجہ کی شگفتگی اور فلسفیانہ انداز جھلکتا ہے۔ زندگی اُن کے لئے ایک ایسی دلکش انجمن ہے جس میں خوشی اور غم دونوں ہی ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں اور ایک کی حیثیت دوسرے سے وابستہ ہے۔ غم کے بغیر خوشی کا کوئی وجود نہیں خوشی محض احساس کا دھوکا ہے۔ چرخ نے زندگی کو ہر پہلو سے دیکھا ہے۔ اس لئے ان کے گلستانِ مسرّت میں آنسو بھی نظر آجاتے ہیں لیکن وہ اس کی دلآویزی کو شبنم کے قطروں کی طرح اور بھی دوبالا کر لیتے ہیں۔ نغمگی اور برجستگی اُن کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔

جوں جوں چرخ زندگی کی منزل پر آگے بڑھتے ہیں، وہ دُنیا کے فریب خوردہ جلوہ سامانوں سے زیادہ واقف ہو کر خدا کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اُن کے آئندہ کلام میں صوفیانہ رجحان کا پیش خیمہ ہے۔

لکشمی نرائن
(آل انڈیا ریڈیو جموں سے براڈ کاسٹ)

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ صدر شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی

کچھ "حسنِ نظر" کے بارے میں

"حسنِ نظر" چرخ چنیوٹی صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ مجموعہ کئی اعتبار سے قابلِ قدر اور قابلِ توجہ ہے۔ سب سے بڑھ کر جو چیز پڑھنے والے کو سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کا نشاطیہ اور شگفتہ انداز اور اُن کی مانوس، جانی پہچانی فضا ہے جس میں ہندوستان کی سوندھی اور رس بھری زندگی رچی بسی نظر آتی ہے اور اِس تمام فضا پر وہ رُومان چھایا ہوا ہے جس نے اس کے تقدس میں رنگینی پیدا کر دی ہے۔ ان کے یہاں عشق کا اظہار بھی ہے اور حُسن کی روائت بھی، مگر عشق کے مقابلہ میں حُسن کی اہمیت کا اظہار زیادہ نمایاں ہے۔ اُن کے بیان میں حُسن کی روائت تو ہے، مگر روائت پرستی نہیں ہے، بلکہ اس میں خارجی مُصوّری کے ساتھ ساتھ حقیقت کی عکّاسی اور جذبات کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے۔ اِس تپش کو ہلکی آنچ سے نمایاں کیا گیا ہے جو سُلگتی رہتی ہے، مگر بھڑک کر فنا نہیں ہوتی۔ یہ خصوصیت ان کو ہندی شاعری سے قریب کر دیتی ہے ؎

چاند سا ماتھا ہے روشن زُلف کے ہالے میں یوں
جیسے کوئی برق ہو بادل کا دوشالہ لئے؛

زندگی نے اِک سوئمبر سا رچا رکھا ہے چرخ
جس کے آنگن میں کھڑی ہے موت جے مالا لئے

اُس کا سارا بدن ہے شرمیلا	اَن چھُوا کوئی پھُول ہو جیسے
اِک ذرا سا بھی ہاتھ لگنے سے	لاجونتی ملُول ہو جیسے؛

رُوکشِ آئینہ ہے رنگ اُس کا	پانی بھرتی ہے موجِ گنگ اُس کا
جب میں گاتا ہوں پیار کا نغمہ	رقص کرتا ہے انگ انگ اُس کا

اُن کی تشبیہات خوبصورت اور اندازِ بیان سادہ ہے۔ یہ سادگی اور پُرکاری ہندوستانی مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔

اُن کی غزلوں میں اگرچہ وہ سوز و گداز نہیں جو دِل کو خون کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے، مگر یہ بھی کیا کم ہے کہ "دِل کو خون کرنے کی حسرت" تو موجود ہے۔ اگرچہ اُن کا مزاج طربیہ ہے، مگر پھر بھی ایسے اشعار مِل جاتے ہیں ؎

آنسوؤ! تم نہ آؤ پلکوں پر	اِس طرح دِل کی بات کھُلتی ہے
آئے کہ نہ آئے تُو اے دوستِ شبِ وعدہ	ہم نے تیری آمد کے رستے تو سنوارے ہیں
مَیں نے سیکھا ہے تری ذات پہ قرباں ہونا	مَیں نہیں جانتا ہوتی ہے محبّت کیسی
اُن کا ہو جاتا ہے دِل دیکھ کے صورت اُن کی	اپنا ہو کر بھی یہ بیگانہ نظر آتا ہے

اگر یہ درست ہے کہ شاعری انسان کی سیرت کا عکس ہوا کرتی ہے، تو "حسنِ نظر" میں چرخ صاحب بے حجابانہ نظر آئیں گے۔ ان کے کلام کی معصومانہ سادگی نے اُن کی شخصیت میں اور بھی نکھار پیدا کر دیا ہے۔

جاوید وششٹ صاحب نے بجا طور پر سچ کہا ہے کہ "چرخ کو اختر شیرانی کے دبستانِ رُومان کا ایک صحت مند رُومانی شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔"

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ چرخ صاحب نے مختلف موضوعات پر جن میں تصوّف کا رنگ بھی ہے اور فلسفہ کا بھی۔ قومیت اور وطنیت سے سرشار جذبہ بھی موجود ہے اور کوئی شک نہیں کہ ان سب میں جو حرفِ مشترک ہے، وہ اُن کا خلوص اور

سچائی ہے، مگر مزاج کے اعتبار سے وہ رومانی شاعر ہیں اور اُن کی رومانیت کا اظہار اُن کے اس مجموعہ "حسنِ نظر" میں ملتا ہے۔ ہمارے دعوے کے ثبوت میں اُن کے وہ اشعار جو "وحدت اور آزادی" سے متعلق ہیں، اُن میں کبھی وہ وحدت کا تقدس اور آزادی کی ہنگامہ خیز کیفیت پیدا نہ کر سکے، بلکہ وہاں بھی اُن کے لغزشِ پا کو رومان پرور وادیوں نے سہارا دیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وحدت، آزادی اور رومانیت میں ایک سی فضا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ رومانیت کا تعلق جوانی کے ولولوں کے ساتھ ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ عمر کے تقاضوں کے ساتھ شعر میں وہ رومانیت اور اس کا بے باکانہ اظہار نہ ہو سکے، مگر موجودہ اندازِ فکر کو دیکھ کر یہ ضرور احساس ہوتا ہے کہ وہ رومانی فضا باقی رہے گی جو شعر کے تغزل کو بڑھاپے کی سنجیدگی میں ملوث نہ ہونے دے گی۔

اگرچہ چرخ صاحب کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور دعوے کے لئے اشعار کی بھی کمی نہیں، مگر کوتاہیِ داماں اس کی متحمل نہیں۔ مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ چرخ صاحب کا کلام اہلِ سخن سے داد لے گا اور قبولِ عام اس کو سند بخشے گا۔

ظہیر احمد صدیقی

ماھنامہ "سب رس" حیدر آباد (دکن) بابت ماہ فروری ۱۹۶۸ء

"حسنِ نظر"

"یہ چرخ چنیوٹی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ۲۶ صفحات تک تعادفی مضامین ہیں اور صفحہ ۲۷ سے کلام شروع ہوتا ہے ۱۸۰ صفحے تک۔ قطعے ہیں اور اس کے بعد غزلیں۔ کلام شاہد ہے کہ چرخ فن سے واقف ہیں۔ اچھوتی تشبیہوں اور استعاروں پہ قادر ہیں۔ زبان شستہ اور رواں ہے۔ شعر گوئی کا ذوق نہایت لطیف اور پاکیزہ ہے۔ توقع ہے کہ کلام مقبولیت حاصل کرے گا۔"

جناب رام کشن صاحب مضطر ایم۔ اے۔ شاعرِ خاص روزنامہ "ملاپ" نئی دہلی

جناب چرخ چنیوٹی کا "حسنِ نظر"

"جناب الیشر داس چرخ چنیوٹی کے کلام کو تقسیم ملک سے بہت پہلے شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ لاہور سے شائع ہونے والے مقتدر ادبی رسائل اور جرائد میں اُن کی پُر کیف اور بلند پایہ نظمیں اور دلآویز اور نشاط انگیز غزلیں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ حضرت اختر شیرانی مرحوم کی صحبتوں میں جناب چرخ کے مذاقِ شعری کو فروغ حاصل ہوا۔

جناب چرخ کے ذوقِ سلیم اور فطری استعداد نے اُن کے اندازِ سخن میں وہ دلکشی پیدا کی کہ اہلِ نظر دل و جان سے ان کی قدر کرنے لگے۔

تقسیم ملک کے بعد بھی جناب چرخ کی رنگین بیانی اور گل فشانی کا وہی عالم ہے۔ اگرچہ اب وہ شعر و سخن کی محفلوں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں

لیکن اُن کے حسنِ بیاں اور بیانِ حسن کی لطافت اور رعنائی روز افزوں ہے

جناب چرخ چنیوٹی کے کلام کے کئی مجموعے طبع ہو چکے ہیں "حسنِ نظر" جناب چرخ چنیوٹی کا تازہ ترین مجموعہ ہے جو ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ بزم جمال اردو، ۱۱۴۳۴۴ جی۔ ٹی روڈ، شکتی نگر، دہلی سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اِس مجموعہ میں جناب چرخ کے قطعات، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اسے جناب چرخ کی نئی تخلیقات کا حسین وجمیل انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ جملہ محاسن کے لحاظ سے یہ دلکش مجموعہ ایک قابلِ قدر شاہکار ہے۔

سیّد شہباز حسین ایڈیٹر "آج کل" دہلی۔

"بے لاگ رائے"

چرخ چنیوٹی کے مجموعۂ کلام "حسنِ نظر" نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ اکثر اشعار دل کو چھوتے ہیں خصوصاً اُن کا یہ قطعہ

دن کو کہتے ہیں رات کا وعدہ۔ شب کو دن کا فریب دیتے ہیں
اُن کے وعدوں کا کچھ یقین تو نہیں۔ آج کا دن بھی دیکھ لیتے ہیں

بہت خوب ہے۔ اِسی طرح دوسرے قطعے اور غزلوں کے اشعار بھی بہت اچھے ہیں۔ مجھے امیّد ہے، اُن کا یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

شہباز حسین
۹ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

افتخارِ وطن جناب شمیم کرہانی

"بے لاگ رائے"

"آپکا مجموعۂ کلام "حسنِ نظر" نظر سے گذرا۔ یقین مانئے، مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپکے کلام میں خیالات کی رنگینی، اظہارِ بیان کی سادگی، واردات کی صداقت اظہارِ الفاظ کی رعنائی اور شبابِ محشرساماں کی نقاشی قابلِ داد ہے۔ امید ہے کہ آپ کا کلام اردو دنیا میں اور بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائیگا اور قبولِ عام کی سند حاصل کریگا"۔

آپ کا مخلص شمیم کرہانی - ۶۸-۲-۳

۲۴۳ - کوچہ میر عاشق، چاوڑی بازار - دہلی ۶

ڈاکٹر تعلیق انجم، ایم۔ اے، پی ایچ ڈی۔ صدر شعبہ اردو، کروڑی مل کالج۔ دہلی

"تبصرہ"

"حسنِ نظر" چرخ چنیوٹی کا تازہ مجموعۂ کلام ہے۔ اس کے آغاز میں بھی چار مختصر تعارف اور تقریظیں شامل ہیں۔ چرخ، ارضِ پنجاب کے کہنہ مشق شاعر ہیں تقسیم سے قبل وہ اختر شیرانی کی بے تکلف صحبتوں سے بھی فیضیاب ہوئے۔ کچھ اس کا اثر، کچھ مزاج کی فطری افتاد چرخ کی شاعری، جذباتی رنگینی اور نشاط پرستی کی شاعری بن گئی۔ اس مجموعے کے قطعات اور غزلیات میں بھی جذبہ و احساس کی نغمہ سرائی ہے۔ ان کا تخیل، ان کے حسنِ نظر کا پروردہ ہے۔ الفاظ اور بحروں کے انتخاب میں بھی ایک نغمہ ناکیفیت ہے۔ وہ رسمی مضامین سے دامن بچا کر اپنے لطیف احساسات کو شعر کا قالب دیتے ہیں۔ کہیں کہیں پنجاب کے ماحول کا احساس بھی اشعار میں مزہ دے جاتا ہے۔" تعلیق انجم

۶۷-۱۱-۱۷

شاعرِ نغز گفتار جناب شیش چند طالبؔ دہلوی جانشین افتخار الشعراء حضرت بسمل دہلوی

"حُسنِ نظر" میری نظر میں

محترم لالہ ایشر داس جی تخ جینیوٹی کافی عرصے سے دہلی میں مقیم ہیں۔ گاہے بگاہے اُن کا مختلف النوع کلام ادبی جرائد میں نظر سے گزرتا رہا ہے۔ مقامی شاعروں میں بھی اکثر آپ سے ملنے اور آپ کی زبانی آپ کا کلام سُننے کا اتفاق ہوا ہے۔

مشاعروں کی ملاقاتیں یا مشاعروں کی وقتی واہ واہ کسی شاعر کا مقام متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوا کرتی۔ یہی باعث تھا کہ جی تخ صاحب سے فی الحقیقت میں اُس وقت متاثر ہوا جب آپ شاعرِ خوش کلام حضرت بخشی اختر امرتسری کے ہمراہ غریب خانے پر تشریف لائے (اگرچہ یہ ملاقات بے حد مختصر تھی) اور ان کی شاعرانہ عظمت اُس وقت مجھ پہ آشکار ہوئی جب اُن کا مجموعۂ کلام "حسنِ نظر" میرے مطالعہ میں آیا۔

معلوم ہوا کہ "حسنِ نظر" کی اشاعت سے قبل آپ کے دو اور مجموعے "آہیں" اور "جلوۂ انجم" زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ نظر حضرات سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مذکورہ مجموعے چونکہ میری نظر سے نہیں گزرے ہیں، اس لئے میں اپنے تاثرات "حسنِ نظر" تک ہی محدود رکھوں گا۔

"حسنِ نظر" کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو گئی کہ اگر انسان محض موزوں طبع ہو، ساتھ ہی اُس کا مطالعہ وسیع اور عمیق ہو اور خوش بختی سے اُسے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میسر آ جائے، تو اُس کا ذوقِ صمیم خود اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اُسے کسی کے رُوبرو زانوئے ادب تہہ کرنے کی احتیاج نہیں ہوتی۔

حضرت چرخ بقولِ خود "لالہ خود رو" ہیں۔ لیکن حقیقتاً "تلامذہ رحمٰن" میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اُس میں اُن کا ذوقِ فطری، اُن کی لگن، اُن کی جستجو، کچھ سیکھنے، جاننے اور حاصل کرنے کی تمنّا بیش از بیش کارفرما ہے۔

"حسنِ نظر" قطعات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ بطورِ مُشتے نمونہ از خروارے کے چند قطعات پیش کرتا ہوں۔ زاں بعد چند اشعارِ آبدار سے اہلِ ذوق حضرات کی تواضع کی جائے گی۔

اُمید ہے، میرے حسنِ انتخاب پر آپ حضرات صاد فرمائیں گے۔ تو ہوں ملاحظہ ہو حضرت چرخ ارشاد فرماتے ہیں ؎

ترے جلال کی عظمت ہے عرش سے بالا
بڑے بڑے ترے کوچے میں جھک کے چلتے ہیں
یہ اہلِ دہر تو کیا ہیں، فقیر بھی آکر
صدائے خیر لگاتے ہیں رُک کے چلتے ہیں

نقابِ حسن کا اک تار بھی وہ چھو نہ سکے
جو اپنے زعم میں اُن کے قریب سے نکلے
حضورِ حسن اُنہی کو زکات ملتی ہے
فقیر بن کے جو کوئے حبیب سے گزرے

جہاں تک رومانی شاعری کا تعلق ہے، حضرت چرخ چنیوٹی کے قطعات مرحوم اختر شیرانی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ بنظرِ غائر اگر دیکھا جائے تو آپ (مراد حضرت چرخ سے ہے) کا اصل رنگ بھی یہی ہے۔ چند قطعات ملاحظہ ہوں ؎

دلکش آئینہ ہے رنگ اُس کا
پانی بھرتی ہے موجِ گنگ اُس کا
جب میں گاتا ہوں پیار کا نغمہ
رقص کرتا ہے انگ انگ اُس کا

اردو شاعری میں ہندی کی یہ آمیزش آپ کے حسنِ بیاں میں اضافے کا باعث ہے اور اس لئے بے حد قابلِ قدر ہے۔ مزید قطعات ملاحظہ ہوں ؎

بدن میں لوچ ہے شاخِ صنوبریں کی طرح
لبوں میں حسنِ لطافت ہے یاسمیں کی طرح

ترے جمال کی اِک اِک ادا کے محور پہ
نگاہ گھومتی ہے گردشِ زمیں کی طرح

چمن میں آ کہ بہاروں کا کوئی گیت چلے
کلی کلی سے تبسّم کی بات چیت چلے

تو ہی بتا کہ فضائیں اُداس ہوں کہ نہ ہوں
ترے فراق میں کتنے زمانے بیت چلے

اُن کا سارا بدن ہے شرمیلا!
اَن چھوا کوئی پھول ہو جیسے

اک ذرا سا بھی ہاتھ لگنے سے
لاجونتی ملُول ہو جیسے

برق و باراں کی طرح ہم سے تعلّق رکھو
پردہ داری بھی رہے، آنکھ مچولی بھی رہے

قتل کرنا ہو تو مہندی بھرے ہاتھوں سے کرو
رنگِ اُلفت بھی رہے، خون کی ہولی بھی رہے

ہم نے رنگِ جنوں بھی دیکھا ہے
عالمِ پُرسکوں بھی دیکھا ہے

فتنہ زا ہے ہر اک ادا اُن کی
یُوں بھی دیکھا ہے، یُوں بھی دیکھا ہے

غم بھرے آنسوؤں کو پی لوں گا!
میں تو اپنی زبان سی لوں گا!

دیکھ لو تم بھی توڑ کر رشتہ!
مجھ میں ہمّت ہوئی تو جی لوں گا

رومانی شاعری کا حق آپ غزلوں میں بھی ادا فرماتے ہیں۔ مثلاً ؎

رنگینیٔ شباب کے انداز دیکھ کر
ہم نے جو کیں حسین خطائیں نہ پُوچھیے

وہ سُرخ ہونٹوں پہ چاندی بکھیری ہنسی کی کرن
شفق میں جیسے تجلّی سحر کے آنے کی

ناز تیرا بجا ہے موجِ صبا
تیری اُس پھول تک رسائی ہے

رُوٹھنا جرم نہیں، رُوٹھ، مگر یہ تو بتا
رُوٹھنے کی یہ ادا تجھ میں کہاں تھی پہلے

کسے حاصل تیرے دو ہاتھ کی دُنیا رشکے
آج مائل بہ شرارت تیری انگڑائی ہے

زندگی حاصلِ گُناہ سہی
زندگی حاصلِ گُناہ نہیں

مندرجہ بالا اقتباسات سے اِس قدر اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ حضرت چرخ اُن شعرائے کرام میں سے ہیں جن کا کلام نہ صرف مشاعروں میں بلکہ کاغذ پر بھی اپنے ایسے اَن مِٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے جو دِلوں اور دماغوں میں عرصۂ دراز کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں اور یہی وہ کسوٹی ہے جہاں ایک اصلی اور حقیقی شاعر اپنی انفرادی خصوصیات کے باعث متشاعر اور نقّال حضرات کے درمیان سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ مقامِ مسرّت ہے کہ چرخ صاحب کا شمار اوّل الذکر طبقہ میں ہوتا ہے۔

چرخ صاحب کو خُدا جانے کیوں احساسِ پیری ہو چلا ہے، حالانکہ اُن کا ایک بال بھی سپید نہیں ہوا اور چشمِ بد دُور، آپ کی صحت بھی ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔ یُوں بھی حقیقی شاعر کبھی بُوڑھا نہیں ہوتا کیوں کہ بڑھاپے کا تعلق جسم سے کم اور دل و دماغ سے کہیں زیادہ ہے۔

شعر و ادب کو مستقبل قریب میں چرخ صاحب سے بجا طور پر بہت سی خوش آئند توقعات ہیں جنہیں بطرزِ احسن و تحسین و خوبی بدرجہ اتم پورا ہونا ہے۔

نیاز مند:۔
طالب دہلوی
۱۰ ر ستمبر ۱۹۶۷ء

آفتابِ سخن لالہ انوپ چند آفتاب، پانی پتی
(راجیہ کوی ہریانہ)

"حسنِ نظر" انتہائی پُر اثر، دلکش اور معنی خیز قطعات اور غزلیات کا حسین دلربا و جاذبِ نظر مجموعہ ہے جس میں ہر خاص و عام کے لئے بہترین دلچسپیوں کا سامان موجود ہے!

"انوکھے استعارے اور اچھوتی تشبیہات چرخ صاحب کے کلام کی رُوح ہیں"

آفتاب پانی پتی
۸ار دسمبر ۱۹۶۸ء

ساحرِ سخن بخشی رام لبھایا ساحرؔ امرتسری، ٹریڈ مارک اٹارنی، امرت سر

"جناب چرخ ایک خوش بیان خوش طبع اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ کی تازہ تصنیف موسومہ 'حسنِ نظر' کو جو کم و بیش ۱۰۰ قطعات و غزلیات کا مُرقّع ہے، اگر 'حسنِ نظر بہ کیف دارد' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چونکہ تصنیف ہذا کا ہر شعر کیف زا اور دلربا انداز ہے۔

"استعارہ اور تشبیہہ کا استعمال نمایاں ہے۔

"دُعاگو ہوں کہ آپ کی تصنیف ہذا مقبولِ عام ہو۔"

آر۔ایل بخشی ساحرؔ امرتسری
بازار پھلہ بنیاں
۱۴ار نومبر ۱۹۶۷ء

شاعرِ وطن جناب خضر برنی صاحب۔ ادارہ "شمع" نئی دہلی

بے لاگ رائے

چرخ چنیوٹی صاحب کا مجموعۂ کلام "حسنِ نظر" نظر سے گزرا۔ غزل میں حسنِ ملیح اور انداز بیان میں واقعاتی شعور و حسن کی لطافتیں بہر عنوان وافر ملتی ہیں۔ غزل کے ہمہ گیر ساز کو چھیڑنے والے چرخ چنیوٹی کے ذہن و مزاج میں ندرت، وہ بھی حسین طنز اور ادبی قدروں کے سایے میں، قدیم اور جدید تقاضوں کی نمائندہ اور اپنی انفرادیت کی ترجمانی کی زندہ تصویر نظر آتی ہے۔ جناب چرخ نے ہر قطعہ میں قوسِ قزح کی رنگینیاں سمو کر لطیف طنز کی چاشنی سے نیاپن پیدا کیا ہے۔ حزن و ملال سے پہلو تہی کر کے ماحول کو زندگی اور زندگی کو ایک نئی تڑپ عطا کی ہے۔ اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ مشاہدات اور واقعات سے مطابقت کا حامل ہے۔ فنی پختگی، اور استعارات کا امتزاج قابلِ داد ہے۔

ؔ اُن کے چہرے کے گرد یوں زلفیں ۔۔۔ بے نیازانہ سرسراتی ہیں!
اک سپیرے کی بین پہ جیسے ۔۔۔ ناگنیں ناچ کے لہراتی ہیں

ؔ جب وہ آئے گھٹے گھٹے آنسو ۔۔۔ میری پلکوں پہ یوں مچل کے چلے
جیسے بچہ نکل کے مکتب سے ۔۔۔ گھر کی جانب اچھل اچھل کے چلے

ؔ جب وہ محفل سے اُٹھ کے جاتے ہیں ۔۔۔ حسرتِ شوق یوں سنبھلتی ہے
زندگی اِک جوان بیوہ کی ۔۔۔ جیسے پہلو بدل کے چلتی ہے

ایسی خوبصورت اور دلنشیں تشبیہات بہت کم دیکھنے میں آئی۔ کلامِ فارسی بالخصوص رباعیاتِ خیام میں البتہ دلفریبی اور زندگی کی ہمہ رنگی کا انداز ضرور پایا

جاتا ہے۔ شاعر اپنی قسمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ البتہ اس کا کلام ذہنی فکر اور ندرتِ فن کا آئینہ دار ضرور رہتا ہے۔ میں انہیں اس تصنیف پر مبارک باد دیتا ہوں اور امید کی جا سکتی ہے کہ چرخ کا نمائندہ کلام آنے والی نسلوں کے لئے رہنمائی کا باعث ہو گا۔

ان کے کلام میں ایک پیغام ہے جو ایک والہانہ زندگی کے لئے نیا جوش، نئی اُمنگیں اور حوصلہ نواز تڑپ بخش کر منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔

موصوف کا کلام ادبی دستاویز ہے جو ناقابلِ فراموش ہے اور ہمہ گیر بھی۔ میری دُعا ہے کہ چرخ صاحب آسمانِ صحافت کی تابندگی کے لئے دیر تک زندہ رہیں۔

حق تو یہ ہے کہ جنابِ چرخ شاعرِ دوراں ہیں، شاعرِ حزن و ملال نہیں۔

خضر تمنائی

۱۱ر فروری ۱۹۶۸ء

ڈاکٹر کامل قریشی دہلوی ایم اے پی ایچ ڈی شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی

"حسنِ نظر" میری نظر میں

کہا گیا ہے کہ اصل میں دنیا غم والم سے معمور ہے، ہر جگہ غم ہی غم ہے۔ انسان کی شب و روز کی کوشش غم سے نجات حاصل کرنے اور خوشی کی جستجو کے لئے ہی نہیں جس انسان کو ذرا خوشی مل گئی، سمجھو اسے کچھ وقفہ کے لئے غم سے نجات ہوئی جب اس ملی ہوئی خوشی کا وقت ختم ہو جائے گا، پھر غم اسے آگھیرے گا۔ بہ الفاظ دیگر غم سے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کرنا خوشی ہے، ورنہ خوشی کوئی مستقل چیز نہیں۔ خدائے سخن میر نے کہا ہے

؎ غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا　　غم کے جانے کا نہایت غم رہا

ہر سانس کی رخصت پیامِ موت ہے۔ اس بات کو اور بھی واضح صورت میں فانی نے اس طرح کہا ہے

؎ ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانی　　زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

زندگی کے غم کو مسلّم حقیقت تسلیم کرتے ہوئے غالب نے بھی کہا ہے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

میر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے زندگی کی سختیوں اور تلخیوں میں شب و روز بسر کرنے کے بعد غم والم کی حقیقت کو سمجھ کر غم کو جزوِ زندگی بنا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام سوز و گداز اور غم والم کی ایک ایسی تصویر ہے جو ان کے فلسفۂ غمِ زندگی کی بھرپور عکاسی ہے۔ مگر غم کی حقیقت کو مان لینے کے باوجود میر نے غم کے آگے سپر نہیں ڈالی البتہ زندگی کے آخر تک اس سے نباہ کرتے رہے۔ فانی نے اس کے برعکس کیا۔ انہوں نے غم سے ہار مان لی اور اس اعترافِ شکست نے زندگی کی ایک ایسی بھیانک تصویر دکھائی جس میں ان کا غم والم، آہ و فغاں، گریہ و زاری، ماتم و بین، موت لحد اور کفن و میّت نظر آنے لگے۔

غالبؔ نے زندگی کے عیش و طرب اور رعنائیوں کے ساتھ ساتھ اس کے غم و الم پر بھی فلسفیانہ نظر ڈالی اور اس کی مسلّم حقیقتوں کا مختلف انداز سے تجزیہ کیا لیکن انہوں نے جہاں حقیقتِ غم سے منہ نہیں موڑا، وہاں اُس کو خود پر حاوی بھی نہیں ہونے دیا۔

خوشی اور غم کے اس تفصیلی جائزے کی روشنی میں ایک بات خاص طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ زندگی کے سلیقے سے واقف ہیں، وہ خوشی نہ ملنے پر بھی مایوس نہیں ہوتے وہ جب غم و الم میں گھر جاتے ہیں تو حتےّ المقدور ان سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر انہی میں خوشی کے امکانات پیدا کرنے کی جستجو کرتے ہیں اور جب کچھ بھی ممکن نہیں ہوتا تو غم سے ہی نباہ کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ اس نباہ سے شدتِ غم کا احساس گہرا نہ ہو اور غم ہی میں ڈوب کر خوشی کا سا لُطف پیدا کیا جا سکے۔ ایسے مردانِ ہمت ہر دور میں ہوئے ہیں۔ اس دور میں دوسرے ایسے فنکاروں کے علاوہ جن کے خیالات اس نظریۂ زندگی کے حامل ہیں جگرؔ مرحوم جنیوٹی کے کلام کا خالص فکری حصّہ زندگی کے غم کو خوشی سمجھ کر اپنا لینے کی ایک بہترین مثال ہے۔ جگرؔ نے غم سے تنگ آکر اس سے بگاڑ پیدا کرنے کے مقابلے میں غم سے نباہ کرنے کو ترجیح دی ہے تاکہ غم کو ہی جزوِ زندگی بنا کر اس میں خوشی کے سامان پیدا کئے جائیں۔ جگرؔ مرحوم نے کہا ہے ؎

کیونکر ہنسیں نہ اشک فشانی کے ساتھ ساتھ ہنستی ہیں بجلیاں بھی تو پانی کے ساتھ ساتھ

زندگی کی سختیوں اور مشکلوں کو ہنستے ہنستے جھیل لینا اور ان سے آخر تک نباہ کرتے رہنا ہی زندگی گزار لینے کا بہترین گُر ہے جسے وہی اپنا سکتا ہے جو زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزر چکا ہو۔ حالات و حادثات کے زہریلے اور کڑوے گھونٹ پی چکا ہو اور جو غم کو اصغرؔ کی طرح غمِ جاناں قرار دیتے ہوئے زباں پہ یہ بات لے آئے کہ ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ملا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

چرخ چینیوٹی نے بھی غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنانے کا گُر سیکھ لیا ہے۔ چونکہ وہ جانتا ہے کہ انسان کو جب تک وہ زندہ ہے غم سے نجات نہیں۔ اس لئے بقولِ غالب غمِ روزگار کو اگر غمِ عشق بنا لیا جائے تو ایسا غم مبارک غم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ چرخ غمِ دوراں کو بھلا دینے کے لئے محبوب کی مُسکراہٹ کا طالب ہے۔ اس قطعہ میں کس خوبصورتی کے ساتھ اس بات کا تجزیہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کسی کے مرمریں سینے کا دودھیا آنچل
جو ہاتھ آئے تو سب کچھ لُٹا کے بات کروں
وہ مُسکرا کے ادھر دیکھ لیں اگر اک بار
غمِ جہاں کو میں ٹھوکر لگا کے بات کروں

چرخ تاریکی سے اُجالا، بے چینی سے راحت اور نفرت سے محبت کرنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ وہ شبِ غم کو پہاڑ تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اندھیری اور سنسان راتوں میں آہ و فغاں سے کام نہیں لیتا۔ اُس نے ہر مخالف شئے کا نعم البدل تلاش کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ شبِ غم سے بھی حسین کام کی آرزو رکھتا ہے اور ہر شبِ غم اُسے اپنے محبوب کی یاد تازہ کرا دیتی ہے۔ اس لئے وہ شبِ غم کا شاکی نہیں بلکہ قدردان ہے ؎

میں شبِ غم کی قدر کیوں نہ کروں۔ دوست کی یاد بن کے آئی ہے

شبِ غم کی تنہائیوں میں اُسے محبوب کی یاد آتی ہے اور ~~اس~~ جہاں اس کی خلوتوں کو جلوتوں میں بدل دیتی ہے، وہاں اس کے دل میں کچھ ارمان اور آرزوئیں بھی کروٹیں لیتی ہیں۔ وہ ایسے عالم میں جانے کیا کیا سوچتا ہے۔ وصل کے امکانات سے خود ہی خود شادماں ہوتا ہے اور ہجر کے تصوّر سے اس میں اضمحلال کی کیفیت بھی گھر کرنے لگتی ہے، لیکن ذہنی کشمکشوں میں پھنسنے کے بعد پھر وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہے اور کہتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے ؎

اِک ذرا تم قریب آجاؤ
ہم بھی دیکھیں کہ زندگی کیا ہے
جھومتی ہیں جوانیاں کیسے
حُسن کا رنگِ دلبری کیا ہے

یا یہ زندگی کے اداس لمحوں کا — آئینہ چور چور ہو جاتا
تم جو میرے قریب آجاتے — ہر غمِ زیست دُور ہو جاتا

اس میں محبوب سے کوئی گلہ نہیں، کوئی شکایت نہیں، کوئی غم و غصہ نہیں۔ ہاں ایک آرزو، ایک حسرت اور ایک معصوم تمنا ضرور ہے جو بالکل فطری اور انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔

"حسنِ نظر" کے خالص فکری اشعار میں چرخ نے ایسے نظریۂ حیات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اب تک صرف اسی کو مرکزِ بحث قرار دیتے ہوئے کلامِ چرخ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی "حسنِ نظر" میں مختلف موضوعات اور مضامین پر فنکارانہ جادو جگائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پہ ایک جگہ چرخ نے انقلاباتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ قدروں کی تفسیر کی طرف ایک دلچسپ اور طنز آمیز انداز میں اس طرح اشارہ کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ کون سلطنتِ دل کی شاہزادی ہے۔ حریم ناز سے جس نے مجھے صدا دی ہے
خبر نہیں اُسے شاید کہ دورِ عشق گیا۔ جو آجکل کا زمانہ ہے، اقتصادی ہے

محبوب کے حسن و جمال اور اس کے سراپا کی تعریف روائتی طور پہ ہوتی چلی آئی ہے لیکن خاص تشبیہات کے ساتھ چرخ نے بھی اچھوتے انداز میں اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

گگن گگن تیری زلفوں کی بات چلتی ہے — سحر سحر کے اُجالے میں رات جلتی ہے
ترے حسین تصور کا آسرا لے کر — ہزار رنگ میں یہ کائنات چلتی ہے

؎ اُن کے چہرے کے گرد یوں زلفیں — لے نیا زاویہ سر سراتی ہیں
اِک سپیرے کی بین پہ جیسے — ناگنیں زاویے بناتی ہیں

چرخ کی شاعری سے کئی جگہ اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ اُسے محبوب سے اگر کچھ ملا ہے تو صرف چند یادیں جو اُس نے اپنے سینے سے لگا رکھی ہیں اور جب کبھی محبوب کا خیال اُس کے دماغ میں آتا ہے تو یہ یادیں مچل اٹھتی ہیں اور وہ نئے انداز سے یہ کہنے پر بے چین ہو جاتا ہے ؎

دُور اک بجتی سی شہنائی تو ہے | دھڑکنوں میں حسن تنہائی تو ہے
دشتِ دل میں اے غزالہ تیری یاد | چوکڑی بھرتی ہوئی آئی تو ہے

؎ آپ کی یاد چھم چھماتی ہے | اِس طرح دِل کے راجواڑے میں
رقص کرتی ہے اپسرا کوئی | جس طرح اِندر کے اکھاڑے میں

چرخ کی شاعری میں زمانے کے انقلابات کی تصویریں بھی جا بجا نظر آتی ہیں بدلے ہوئے حالات نے موجودہ اِنسان کو جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے اور شب روز کے تلخ و ترش تجربات نے انسان کے دماغ پر جو اثرات مسلّط کئے ہیں، اُن سے چرخ بے خبر نہیں وہ کہتا ہے ؎

حالاتِ حاضرہ نے پریشان کر دیا | برسوں سے کٹ رہی تھی بڑی عافیت کے ساتھ
دوبھر ہے سانس لینا بھی دَورِ جدید میں | کتنا عظیم ظلم ہے یہ حُرّیت کے ساتھ

اِس ناموافقت کے زمانے کو کیا کہیں | جو بھی مِلا۔ ملا وہ ہمیں غیریت کے ساتھ
کیا دِل فروز دَور تھا، دَورِ قدیم چرخ | ملتے تھے دوست یار سبھی اُنسیت کے ساتھ

دَورِ جدید کی آرزو کے وقت شاعر کو یہ خیال تھا کہ شاید پرانے اور دقیانوسی خیالات دَورِ قدیم کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اِنسان کی نظر بلند اور ذہن وسیع ہو گا اور انسان، اِنسان کی قدر کرے گا۔ بیمار انسانیت کا مداوا ہو سکے گا۔ لیکن ہوا سب کچھ اس کے برعکس۔ چرخ نے "حسنِ نظر" میں ایک جگہ شاید اسی سے متاثر ہوتے ہوئے کہا ہے ؎

؎ جذبہ یکجہتی خلوص تھے اچھے دنوں میں چرخ ۔ حیران ہوں میں اب وہ یگانے کدھر گئے

؎ چرخ منہ پھیر لیں جب اپنے ہی ۔ غیر کا کیا گلہ کرے کوئی

؎ خلوص و شوق سے سجتا ہے دوستی کا محل ۔ خلوص و شوق کی ہم لوگ قدر کر نہ سکے

؎ غیر کے طعنے، بتوں کی ناخوشی، اپنوں کی چوٹ ۔ دل کی خاطر کیا کہوں کیا کیا سہے جاتا ہوں میں

چرخ چنیوٹی کو اگرچہ پیر مغاں اختر شیرانی کی صحبت بھی نصیب رہی ہے لیکن بذات خود بنت عنب کو منہ نہیں لگایا اور کبھی پی تو اس انداز سے ؎

رنگ بوئے گلاب ہو جاؤں ۔ حسن تعبیر خواب ہو جاؤں

یوں پلا دے نشیلی نظروں سے ۔ بے نیاز شراب ہو جاؤں؛

بے نیاز شراب ہو کر بھی وہ برابر پیتا رہا اور اتنی پی کہ آج تک سرشار ہے حیات و کائنات اور عصر حاضر کے مختلف مسائل پر خیال آرائی کرنے کے علاوہ تصوف کے مسئلہ پر بھی چرخ نے اپنے عقائد کا اظہار کیا ہے ؎

مجھ سے شیخ و برہمن کہتے غلط ہیں اے چرخ ۔ جبکہ اک جادۂ منزل کے نشاں ہیں دونوں

عالم وحدت کچھ بنتی ہو، لیکن ۔ تیرے در کا گدا ہے شاہ نہیں

چشم بینا سے کبھی دیکھ کمال وحدت ۔ مے کے ہر قطرے میں میخانہ نظر آتا ہے

مجاز سے حقیقت کی منزل تک پہنچنا ۔ بے غرض محبت کرنا اور خود کو محبوب کی ذات میں ڈبو دینے کے خیالات کا اظہار نیا نہیں، تاہم اس اظہار کے انداز سے مسلک اور محبت کے سچے عقیدے پر روشنی پڑتی ہے۔ چرخ کی شاعری میں اس کی مثال بھی موجود ہے ؎

میں نے سیکھا ہے تری ذات پہ قربان ہونا ۔ میں نہیں جانتا ہوتی ہے محبت کیسی

چرخ چنیوٹی کا "حسن نظر" قطعات، نظموں اور غزلوں پر مشتمل ایک

ایسا مجموعہ ہے جس میں سے دلدادگانِ شعر و ادب، مختلف موضوعات پر پسندیدہ اشعار اچھی خاصی تعداد میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ویسے "حسنِ نظر" کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ چرخ کے یہاں روائت کا عکس بھی موجود ہے اور یہ اس لیے کہ چرخ کی شاعری کا آغاز جس دور میں ہوا اُس کے اثر سے روائت کا آجانا فطری بات تھی لیکن روائت کے ساتھ ساتھ نئے خیالات، نئے افکار اور نئی اقدار کو بھی چرخ نے اپنی شاعری میں خاص جگہ دی ہے اور قدیم و جدید کی آمیزش سے انہوں نے "حسنِ نظر" کو دو آتشہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ انہیں شستہ، صاف اور سہل زبان میں کہنے اور پیاری پیاری تشبیہیں بیان کرنے کا بھی خاص شوق ہے۔ گو کہیں کہیں ان تشبیہوں کے اَن میل اور بے جوڑ ہونے کا بھی دھوکا ہوتا ہے، لیکن کہیں کہیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

نفیس و خوشگوار تشبیہوں سے مرصّع کچھ قطعات جہاں مشاعروں میں داد و تحسین کا سامان موجود ہے، وہاں مخصوص محفلوں میں بھی سخن سنج تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چرخ چینیوٹی اپنی عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ فن کی پختگی کی طرف بھی گامزن نظر آتے ہیں اور بعض اشعار سے اُن کی فنی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ اپنی فکری صلاحیتوں سے مزید کام لیں تو ان میں فنکارانہ جوہر دکھانے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

کامل دہلوی

جناب کرشن موہن ایم۔اے، آئی۔آر۔ایس، نئی دہلی

تبصرہ

چرخ چینیوٹی کا شعری شاہکار "حسنِ نظر" واقعی شاعر کے حسنِ نظر کا غماز ہے۔ اس کتاب کے ورق ورق سے شگفتہ رومانیت مترشح ہے۔ پیارے پیارے افکار اور میٹھے میٹھے اشعار دامن تھام لیتے ہیں۔ ان خوبصورت قطعات سے کون لطف اندوز نہیں ہوگا ؎

دل کے پردے میں تری یاد ہے یوں جلوہ فروز۔ جھگمگاتا ہو انگوٹھی میں نگینہ جیسے
مرمریں سینے پہ موتی جڑے ہاروں کی بہار۔ موج در موج سمندر میں سفینہ جیسے

روئے روشن پہ بال بکھرے ہیں ۔ آرزوؤں کے جال بکھرے ہیں
اِک ذرا ہی نظر اُٹھا دیکھو ۔ ہر طرف کچھ سوال بکھرے ہیں

غزلوں کا رنگ بھی نکھرا ہوا ہے۔ چرخ حسن و شباب اور کیفِ حیات کا ترجمان ہے۔ وہ اُمید و مسرت کا پیغامبر ہے۔ اُس کے کلام میں قنوطیت اور مرثیہ خوانی کا نام تک نہیں۔ ایسا کلام لمحاتِ فرصت کی رونق بڑھاتا ہے اور دل و دماغ کو تازگی و شگفتگی بخشتا ہے۔ حافظ شیرازی نے شاید ایسے ہی کلام کے متعلق کہا تھا ؎

انیسِ کنجِ تنہائی کتاب است ۔۔ فروغِ صبحِ دانائی کتاب است

"حسنِ نظر" کے اشعار اس شعرِ مقبول کی زندہ و تابندہ تفسیر ہیں ؎

زندگی زندہ دلی کا ہے نام ۔ مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

یہ اشعار پڑھ کر سارے دن کی تھکن دُور ہو جاتی ہے اور نشاط و سرور کے

کے ساتھ ایک تازہ شعور سے بھی ذہن آشنا ہوتا ہے۔ چند کیف آمیز اشعار سُنیے اور داد دیجیے ؎

وہ سرخ ہونٹوں پہ چاندنی بھری ہنسی کی کرن ۔ شفق میں جیسے تجلّی سحر کے آنے کی!

سوالِ وصل کا انداز ہی کچھ ایسا تھا ۔ چمک اُٹھے تیرے عارض گلاب کی مانند

مزا تو جب ہے چھپا لیں مجھے بھی دامن میں ۔ ترے شباب کی موجیں حباب کی مانند

ہو تیری زلف کا سایہ کہ مری آہِ رسا ۔ تیرے کوچے میں اک اُڑتا سا دھواں ہیں دونوں

کلی کلی تیرا انداز بن کے کیوں نہ ہنسے ۔ وہ نقش نقش نہیں جس میں تو اُبھر نہ سکے

رُوٹھنا جرم نہیں، رُوٹھ، مگر یہ تو بتا ۔ رُوٹھنے کی یہ ادا تجھ میں کہاں تھی پہلے؟

کرشن موہن

۱۳-۳-۶۸

جناب ڈی۔ ایس ڈوگل بی۔ اے آنرز۔ گزیٹڈ آفیسر نئی دہلی

جناب چرخ چنیوٹی کا مجموعۂ کلام "حسنِ نظر" نظر نواز ہوا۔ چرخ صاحب کا فکر اور اندازِ بیان بڑا دلکش ہے۔ اُن کی شاعری میں نکھرتا ہوا احساسِ جمال جلوہ گر ہے۔ وہ شعر کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں محبت اور محبوب، زندگی کی اوّلین قدروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو کچھ دنیا میں ہے وہ محبوب کی سیم تنی اور گلبدنی کا عکس ہے۔ ایسی رنگین و حسین شاعری کیوں نہ نگاہوں کو متوجہ اور دلوں کو ملتفت کرے۔ چنانچہ میں بھی "حسنِ نظر" سے لُطف اندوز ہوا اور اس کے قطعات اور غزلیات میں جو غنائیت اور جمالیت ہے،

اُن سے تکلیف ہوا۔ میں "حسنِ نظر" کے قطعات کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان قطعات میں جمال و شباب کی پُربہار رنگینیاں بھرپور موجود ہیں جو چرخ صاحب کی فن کاری کے اعلےٰ نمونے ہیں۔ اُن کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیے ؎

سفید کندھوں پہ زُلفِ سیاہ لہرائے۔ وہ آ رہے ہیں سفید و سیاہ کے مالک
عیاں ہے چاند سے چہرے سے جلوۂ خورشید نکھر کے کیوں نہ چلیں مہر و ماہ کے مالک

اس قطعہ میں جو شانہ سفید اور زلفِ سیاہ کی حسین بندش اور لطافتیں ہیں، وہ قابلِ داد ہیں۔ دوسرے قطعہ میں جو محبوب کے حسین تصوّر کا جادو بڑے سلیقہ سے جگایا گیا ہے اور کتنی خوبصورتی سے الفاظ کے موتی مصرعوں میں جڑے گئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎

گگن گگن تیری زُلفوں کی بات چلتی ہے سحر سحر کے اُجالے میں رات چلتی ہے
ترے حسین تصوّر کا آسرا لے کر ہزار رنگ میں یہ کائنات چلتی ہے

چرخ صاحب کے قطعات میں بڑا رس ہے اور بڑی سرشاری! کہتے ہیں ؎

سرور و کیف لُٹاتی رہی نظر اُن کی ہم اپنی آنکھ میں بھرتے رہے جگر کا لہو
ہمارا حال کچھ اُن کے حضور ایسا تھا کہ جیسے سہمی ہوئی سی غریب گھر کی بہو

اس قطعہ میں تشبیہ ہندوستانی ماحول کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ ہمالیہ کی تہذیب میں رچا بسا ہوا ہے۔

ہمارے سماج میں صدیوں سے حسن و حیا کو لازم و ملزوم سمجھا گیا ہے۔ ہرچند یہ سارے مشرق کا زاویۂ نگاہ ہے۔ لیکن پراچین بھارت سے لے کر ہم آج تک ایسے حسن کے نغمہ سرا ہیں جو معصوم ہے اور حیادار ہے۔ عشق کے لئے جان دے دینا پسند کرتا ہے لیکن افشائے راز کے لئے راضی نہیں۔ چرخ صاحب نے اس معیاری محبوب کا

نقشہ اپنے اس قطعہ میں بڑے حسین پیرائے میں کھینچا ہے ؎

اُن کا سارا بدن ہے شرمیلا اُن چھوُا کوئی پھوُل ہو جیسے
اِک ذرا سا بھی ہاتھ لگنے سے لاجونتی ملوُل ہو جیسے

چرخ صاحب نے وحدت کے متعلق بھی قطعات لکھے ہیں جن میں 'گیتا' کے متعلق جو قطعات ہیں، وہ بصیرت پہ مبنی ہیں۔ گیتا کا یہ فلسفہ ابدی قدر کا حامل ہے کہ انسان، کارہائے نیک سے حیات سرمدی حاصل کر سکتا ہے۔ جسم مرتا ہے، رُوح نہیں مرتی۔ عملِ خیر ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور اس کے ذریعہ انسان موت کو بھی تسخیر کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

نیک کاموں سے، نیک جذبوں سے ہر کلی زندگی کی کھلتی ہے
ہے یہ گیتا کا نوُر جس سے چرخ مَوت کو بھی حیات ملتی ہے

چرخ صاحب کی غزلیں بھی ایک خاص سرمستی و سرشاری کا انداز رکھتی ہیں محبوب کے خاص عہدِ شباب کا اظہار یوُں کرتے ہیں ؎

سنور سنور کے بھی گیسو ترے سنور نہ سکے نشے ادا کے کسی طور بھی اُتر نہ سکے

محبوُب چلا گیا ہے اور چمنِ زیست کا ہر پھوُل افسردہ ہے۔ شبستانِ حیات کی ہر لَو تھرتھرا رہی ہے اور سارا ماحول عاشق کی چشمِ پُرنم کی طرح اشک آلود ہے۔

چرخ صاحب اس موقع پہ کہتے ہیں ؎

صبحدم شبنمِ گُل ہو کہ شبستاں کا چراغ میری آنکھوں کی طرح اشک فشاں ہیں دونوں

مجھے پوُری امید ہے کہ "حسنِ نظر" کو جو حسنِ صوری اور حسنِ معنوی دونوں سے مالا مال ہے، اربابِ نظر کی پسندیدگی اور قبولِ عام کی سند حاصل ہوگی۔

ڈی۔ ایس ڈوگل
۱۷-۱۰-۶۷

جناب اندرجیت گاندھی صدر سنٹرل مجلسِ ادب رجسٹرڈ، دہلی

"حسنِ نظر" رقص و سرود، جوش و مستی، جدت، ندرت اور کیف و سرور کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ خالص رومان کا ہی آئینہ دار ہے۔ رومانی شاعری کے اس میدان میں بھاری بھرکم الفاظ کی بندش سے پرہیز کرتے ہوئے سادہ و آسان زبان کو اپنایا گیا ہے۔ ہمیں یقینِ کامل ہے کہ ہماری بزم کے سرپرست جناب چرخ چنیوٹی کا یہ مجموعۂ کلام اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث آسمانِ شعر و ادب پر چمکے گا۔"

اندرجیت گاندھی

جناب محمد شریف صاحب فضل سیکرٹری بزم ادب فرخ آباد (یو۔پی)

"حسنِ نظر" خوش مزاجی، رنگیں بیانی اور جدت پسندی کا ایک مرقع ہے۔ سچ پوچھیے تو کلامِ چرخ ایک نئی نویلی دلہن کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کا آئینہ دار ہے۔ کلامِ چرخ تو بھیگی ہوئی فضا میں بھی۔ مثالِ قوسِ قزح جلوہ بار رہتا ہے۔"

محمد شریف فضل

جناب رام ناتھ جی کھنہ ۱۸۰۰ سومن گنج، سبزی منڈی، دہلی

"حسنِ نظر" کا مطالعہ کیا۔ قطعات کی سادگی اور گہرائی قابلِ داد ہے۔ سادگی سادہ دل انسانوں کو شعر سمجھنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے اور گہرائی شائقینِ ادب کے لیے سنگِ راہ ہے۔"

رام ناتھ کھنہ

"پاسبان" چنڈی گڑھ

"جناب چرخ چنیوٹی سے ہمارا اولین تعارف بھی اسی سرکاری دورہ کے دوران ہوا جس کا پہلے ریویو میں ذکر ہو چکا ہے۔ ایک اور مشاعرہ تھا جس میں چرخ صاحب نے ایک قطعہ پڑھا جس کا پہلا شعر تو گویا دل ہی میں تو کھب کر رہ گیا۔ فرمایا ؎

سفید کاندھے پہ زُلفِ سیاہ لہرائے
وہ آ رہے ہیں سفید و سیاہ کے مالک

تو صاحب! "سفید کاندھے" پہ "زُلفِ سیاہ" اور پھر "سفید و سیاہ کے مالک" پہ ہم نے جو سر دُھننا شروع کیا تو اس دُھن میں دوسرا شعر سُن نہ سکے۔ اب نسخۂ زیرِ نظر میں پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس دُوسرے شعر کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ پہلا شعر بجائے خود ایک قطعہ ہے۔ قابلِ قبول چند قطعات ملاحظہ ہوں ؎

نقابِ حسن کا اِک تار بھی وہ چھُو نہ سکے
جو اپنے زُعم میں اُن کے قریب سے گزرے
حضورِ حسن اُنہی کو زکاتِ حسن ملی
فقیر بن کے جو کوئے حبیب سے گزرے

پسنج پا ہو گئے سبھی جب وہ
میری ارتھی کے ساتھ چلنے لگے!
دُشمنوں کو تو آگ لگنی تھی
دوستوں کے بھی پاؤں جلنے لگے

دن کو کہتے ہیں رات کا وعدہ
شب کو دن کا فریب دیتے ہیں
اُن کے وعدوں کا کچھ یقین تو نہیں
آج کا دن بھی دیکھ لیتے ہیں

چرخ صاحب کے رنگِ تغزل کی چند مثالیں دیکھئے :۔

؎ زندگی حاصلِ گناہ تو ہے ۔ زندگی ماحصل گناہ نہیں

؎ آنسوؤ! تم نہ آؤ پلکوں پہ ۔ اس طرح دل کی بات کھلتی ہے

؎ دن ابھرتا ہے تیرے چہرے سے ۔ تیری زلفوں سے رات بنتی ہے

؎ کھل کے رونے دے چرخ آنکھوں کو ۔ بات کھلنے سے بات بنتی ہے

؎ اس بت کی جواں عمر محبت کا کرم ہے ۔ ہم لوگ کہن سال تو ہیں پھر بھی جواں ہیں

بحیثیتِ مجموعی "حسنِ نظر" ایک کامیاب تصنیف ہے ۔